چند تصویرِ بتاں

شمیم احمد

مکتبہ شاہراہ، اردو بازار، دہلی ۶

چند تصویرِ بتاں

مرتّب
شمیم احمد

مکتبہ شاہراہ۔ اردو بازار۔ دہلی

پہلی بار - جون سنہ ۱۹۶۶ء

تعداد اشاعت ۱۱۰۰

قیمت - تین روپے پچاس پیسے

کوہِ نور پرنٹنگ پریس دہلی

عالیجناب ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی

پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو

دِلّی یونیورسٹی دہلی

کی

خدمت میں

فہرست

مقدمہ

آدمی کے لئے آدمی کی پرکھ بہت مشکل کام ہے۔ کیونکہ وہ جتنا باہر سے دیکھا جاسکتا ہے اس سے کہیں زیادہ اندر چھپا ہوا ہوتا ہے۔ اس چھپی ہوئی تہ در تہ شخصیت کو سمجھنے کے لئے ظاہری نگاہ سے کہیں زیادہ دروں بینی، بصیرت، ژرف نگاہی اور انسانی نفسیات کے فہم وادراک کی ضرورت ہے۔ انسان اپنی روزمرہ کی زندگی میں جو کچھ دیکھتا ہے اس کا ذکر، اس کی نقالی یا اس پر تنقید اس کی فطرت ہے۔ خاکہ نگاری ادب کی ایک ایسی صنف ہے جس میں شخصیتوں کی تصویریں اس طرح براہِ راست کھینچی جاتی ہیں، کہ ان کے ظاہر و باطن دونوں قاری کے ذہن میں نقش ہو جاتے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پڑھنے والے نے صرف قلمی چہرہ ہی نہ دیکھا ہو بلکہ خود اس شخصیت کو دیکھا بھالا اور سمجھا بوجھا ہو۔

آدمی خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو فرشتہ بہر حال نہیں ہو سکتا۔ خاکہ نگار کا کمال یہ ہے کہ اس کی نظر اوصاف کے ساتھ ساتھ ان کمزوریوں پر بھی ہو جو انسان کو فرشتہ ہونے سے بچاتی ہیں۔ خاکہ نگار خواہ کسی شخص کی اچھائی کرے یا برائی، وہ خوبیاں گنائے یا خامیاں مگر اس کا رویہ ہمدردانہ ہونا چاہیئے۔ اسی کے ساتھ ایک خاکہ نگار کیلئے ضروری ہے کہ اس کا لب و لہجہ شخصیت کے مطابق ہو۔ اگر کسی سنجیدہ اور متین شخصیت کا خاکہ لکھنا ہو تو لب و لہجہ میں سنجیدگی اور متانت ہو، اگر کسی مزاحیہ کردار کا خاکہ ہے تو اسی قسم کی زبان کا استعمال ضروری ہوگا۔ خاکہ نہ تو کسی کی مداحی ہو اور نہ ہی نثری ہجو۔

خاکہ نگاری پر بحث کرتے ہوئے محمد حسنین نے لکھا ہے :-

"نوکِ قلم کی تصویر کشی "خاکہ نگاری" ہے جسے قلمی تصویر یا مرقع سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ خاکہ ایسی تصویر ہے جو کسی بت تراش، مصوّر یا فوٹو گرافر کا عمل نہیں۔ اس تصویر کا خالق قلمکار ہوتا ہے ....
خاکہ کسی شخص یا فردِ واحد کی گم سم تصویر نہیں، یہ ہنستی بولتی تصویر ہے جو ہمارے احساسات کو برانگیختہ کرنے کی قوت رکھتی ہے۔"[۱]

خاکہ میں ہم کسی قصّہ کہانی سے لطف اندوز نہیں ہوتے ہم تو ہلکے پھلکے لطیف تاثرات کے مجموعہ سے جو مصنّف کو ذاتی تجربہ کے بعد حاصل ہوتے ہیں لطف اٹھاتے ہیں۔ اس میں افسانوی قسم کی عام، تخیّلی اور رسمی باتیں ہمارے سامنے نہیں آتیں اس میں نہ تو سبز و تفریح کا حال ہوتا ہے اور نہ ہی اس سے متعلق ضمنی اور غیر ضروری باتیں۔ بلکہ اس کے برعکس ہماری نظر میں ایک فردِ خاص ہوتا ہے جس کی شخصیت میں جاذبیت ہوتی ہے، کشش ہوتی ہے اور وہ ایک عجیب و دلکش انداز میں ہمارے سامنے آتا ہے، جس کو پڑھ کر ہم اپنے ذہن میں ایک تصویر اتار لیتے ہیں۔

خاکہ عظیم ہستیوں کا بھی لکھا جاتا ہے اور اس میں عام وا وسط درجے کے افراد بھی نظر آتے ہیں۔ اردو کے تمام خاکہ نگاروں نے صرف ایک ہی طرح کے لوگوں کے خاکے نہیں لکھے بلکہ انھوں نے اس شخص کا خاکہ لکھا ہے جس سے وہ متاثر ہوئے ہیں اور انھوں نے ان لوگوں میں وہ خاص اور اہم باتیں پائی ہیں جو دوسروں میں نہیں ملتیں۔

---

[۱] خاکہ نگاری، محمد حسنین، نیا دور، لکھنؤ۔ اکتوبر ۱۹۶۴ء

ایک کامیاب اور مکمل خاکہ کسی قید و بند کا حامل نہیں ہوتا۔ وہ مولوی عبدالحق کے "حکیم امتیاز الدین"، کے خاکے کی طرح ڈیڑھ صفحے پر بھی مشتمل ہو سکتا ہے اور فرحت اللہ بیگ کے "نذیر احمد کی کہانی"، کی طرح پوری کتاب پر بھی پھیلایا جا سکتا ہے۔
خاکہ نگاری کے متعلق ڈاکٹر خلیق انجم نے لکھا ہے :-

"ادب کی کوئی صنف اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک مصنّف کو اپنے موضوع اور قوتِ بیان دونوں پر پورا عبور نہ ہو خاص طور پر "خاکہ کا فن"، بہت مشکل اور کٹھن فن ہے۔ اسے اگر نثر میں "غزل کا فن"، کہا جائے تو غلط نہ ہوگا جس طرح غزل میں طویل مطالب بیان کرنے پڑتے ہیں ٹھیک اسی طرح خاکہ میں بھی مختصر الفاظ میں پوری شخصیت پر روشنی ڈالنی پڑتی ہے" [1]

خاکوں کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ ان کے ذریعہ ہم خاکہ نگار کی شخصیت کو بھی سمجھ سکتے ہیں۔ گویا "سرِ دلبراں حدیثِ دیگراں"، کی صورت میں خود ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ کیونکہ خاکے میں سرِ دلبراں خود خاکہ نگار کی اپنی ذات ہوتی ہے اور حدیثِ دیگراں کے دائرے میں وہ لوگ آجاتے ہیں جن پر خاکہ لکھا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر خاکہ نگار اپنی پسندیدہ عادتوں اور معیارِ فکر کو سامنے رکھتا ہے۔
اردو میں خاکہ نگاری کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے بلکہ مختصر افسانے کی طرح یہ صنفِ ادب ہمارے یہاں مغرب کے ادبی اثرات کے تحت آئی ہے۔ اگرچہ ہم کو

---

[1] مولوی عبدالحق بحیثیت خاکہ نگار، ڈاکٹر خلیق انجم، مجلس ۱۹۶۰-۶۱ء

قدیم زمانے کے ادب میں اس کے ہلکے پھلکے نقش مل جاتے ہیں جو آج کے خاکے کی طرح مکمل تو نہیں لیکن موجودہ دور کے خاکوں کا دھندلا عکس ضرور کہے جا سکتے ہیں ہمارے شعری ادب میں بھی خاکہ نگاری کی جھلکیاں مل جاتی ہیں مگر قدیم تذکرہ نگاروں نے بعض شاعروں کے متعلق نسبتاً زیادہ تفصیل سے کچھ ایسی باتیں فراہم کی ہیں جن پر خاکوں کا گمان ہوتا ہے۔ جیسے قدرت اللہ قاسمؔ کے "مجموعہ نغز"، سعادت خاں ناصرؔ کے "تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا"، اور محمد حسین آزادؔ کی "آبِ حیات" میں خاکوں کے ابتدائی نمونے مل جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ انشاء اللہ خاں انشاءؔ نے بھی اپنی کتاب "دریائے لطافت" میں چند شاعروں کا حلیہ اس طرح بیان کیا ہے کہ ہم ان کو اردو کے اوّلین مگر نامکمل خاکے کہہ سکتے ہیں۔ انشاءؔ نے "دریائے لطافت" میں ایک جگہ مرزا مظہر جانِ جاں سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے تو ان کی عادات و اطوار اور ان کا حلیہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"آخر کار میں نے اصلاح بنوائی، ڈھاکہ کی ململ کا جامہ پہنا۔ سرخ رنگ کا چیرہ سر سے باندھا اور کپڑے بھی اسی قبیل سے تھے۔ ایک کٹار پٹکے کی میں اڑسا۔ اس ہیئت سے ہاتھی پر سوار ہو کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ موصوف جامع مسجد سے متصل ایک بالاخانے پر رہتے تھے جو ان کے لئے کیول رام بانیہ نے بنوایا تھا۔ جب میں اوپر پہنچا تو دیکھا کہ جنابِ ممدوح پیراہن اور سفید ٹوپی پہنے اور کندھے پر ناشپاتی رنگ کے دوپٹہ کا سموسہ بنا کر ڈالے ہوئے بیٹھے ہیں۔ میں نے نہایت ادب سے سلام عرض کیا، بڑی شفقت اور

خوش اخلاقی جیسا کہ بزرگوں کا دستور ہے سلام کا جواب دیتے ہوئے کھڑے ہو گئے اور مجھ نالائق کے سر کو بغل میں لیکر اپنے پہلو میں بٹھا لیا"۔ [۱]

مولانا محمد حسین آزاد ایک مورخ سے زیادہ انشاء پرداز ہیں اور اس فن میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ انھوں نے "آبِ حیات" میں جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے اکثر شاعروں کا حلیہ، عادات و اطوار، عقائد و نظریات اور ان کی خوبیوں و خرابیوں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ہمارے سامنے بڑی حد تک ان شاعروں کی شخصیت آجاتی ہے۔ اس دلیل کی وضاحت کے لئے مثالیں تو آبِ حیات میں سے کئی پیش کی جا سکتی ہیں مگر ہم صرف ایک مثال پر ہی اکتفا کریں گے۔ ہُدہُد کا حال ملاحظہ ہو جو مختصر ہونے کے باوجود بے حد دلچسپ ہے:۔

"مولوی صاحب (ہُدہُد الشعراء) کی چُگی داڑھی اس پر لمبی اور نُکیلی۔ سر منڈھا ہوا، اس پر نکو عمامہ۔ فقط کھٹ بڑھئی نظر آتے تھے۔ حکیم صاحب (آغا جان عیش) نے کہا شعراء کو تخلص بھی ایسا چاہیئے کہ ظریفانہ و لطیفانہ ہو اور خوش نما ہو اور شان و شکوہ کی عظمت سے تاجدار ہو۔ بہتر ہے کہ آپ ہُدہُد تخلص کریں حضرت سلیمان کا راز تھا اور قاصد خجستہ گام تھا وغیرہ وغیرہ چنیں و چناں مولوی صاحب نے بہت خوشی سے منظور فرمایا"۔ [۲]

---

[۱] دریائے لطافت، انشاء اللہ خاں انشاؔ، مترجمہ پنڈت دتاتریہ کیفی دہلی ص ۲۷/۲۸

[۲] آبِ حیات، محمد حسین آزاد، دہلی ص ۶۰۳

مختصر الفاظ میں ایک کامیاب خاکہ کی تعریف یہ ہوئی کہ "خاکہ نگاری" یا "خاکہ کشی"، ایسی ہونی چاہیئے کہ ہم اس شخص کو بغیر دیکھے بھی پوری طرح جان جائیں اور مصنّف اس شخصیت کے جس پہلو سے متاثر ہوا ہے اس کی جزئیات بڑے موثر الفاظ میں پیش کر دے۔ گویا خاکہ نگار قاری کو ایسے مقام پر لے جاتا ہے جہاں سے وہ خود خاکے کی شخصیت اسی زادیئے سے دیکھ لیتا ہے جس زاویئے سے خاکہ نگار نے دیکھا ہے۔

یہاں یہ ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ ہمارے بعض ادیب[۱] کئی کتابوں کو خاکے کے زمرے میں شمار کرتے ہیں حالانکہ وہ حقیقت میں خاکے نہیں ہیں۔ جیسے "صُید و ہدف"، "ملکِ ادب کے شہزادے" اور "محمد علی کی ڈائری"، وغیرہ وغیرہ "صُید و ہدف" کے مصنّف غلام احمد فرقتؔ نے خود اپنے مضامین کو "مزاحیہ وطنزیہ" لکھا ہے۔ اس کتاب کے کسی مضمون کو خاکہ نہیں کہا جا سکتا۔ دوسری کتاب "ملکِ ادب کے شہزادے" ہے۔ اس میں بھی ڈاکٹر اعجاز حسین نے مختلف اشخاص کے متعلق اپنے تاثرات قلمبند کئے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ایک یادداشت کے طور پر لکھی گئی تھی اسی طرح "محمد علی کی ڈائری" کے کسی بھی حصّے پر خاکہ کا اطلاق نہیں ہوتا۔

اس بحث سے میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ آج تک جو مضامین، انشائیے اور روزنامچے خاکوں کے ذیل میں شمار کئے جاتے رہے ہیں ان میں سے اکثر فنِ

---

[۱] اردو میں خاکہ نگاری، نثار احمد فاروقی، نقوش لاہور، مئی ۱۹۵۹ء

خاکہ نگاری کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے۔

میں نے اس انتخاب میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ صرف وہی مضامین جگہ پائیں جو صحیح معنوں میں خاکے کہے جا سکتے ہیں۔

موجودہ دور میں ہم کو نہ تو خاکوں کے بارے میں اہم معلوماتی ذخیرہ ملتا ہے اور نہ ہی اردو کے اچھے خاکوں کا انتخاب۔ اسی ضرورت کے پیشِ نظر میں نے اس مختصر مقالہ کے ساتھ اردو کے چند خاکوں کا انتخاب بھی شامل کر دیا ہے تاکہ فنِ خاکہ نگاری کے تدریجی ارتقاء کے بارے میں اردو کے طلبہ کو ضروری معلومات فراہم ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے سامنے چند اچھے خاکے بھی آ جائیں۔

شمیم احمد

لیکچرار شعبہ اُردو۔ کروڑی مل کالج
دِلّی یونیورسٹی،
دہلی
۲۵ر دسمبر ۱۹۶۵ء
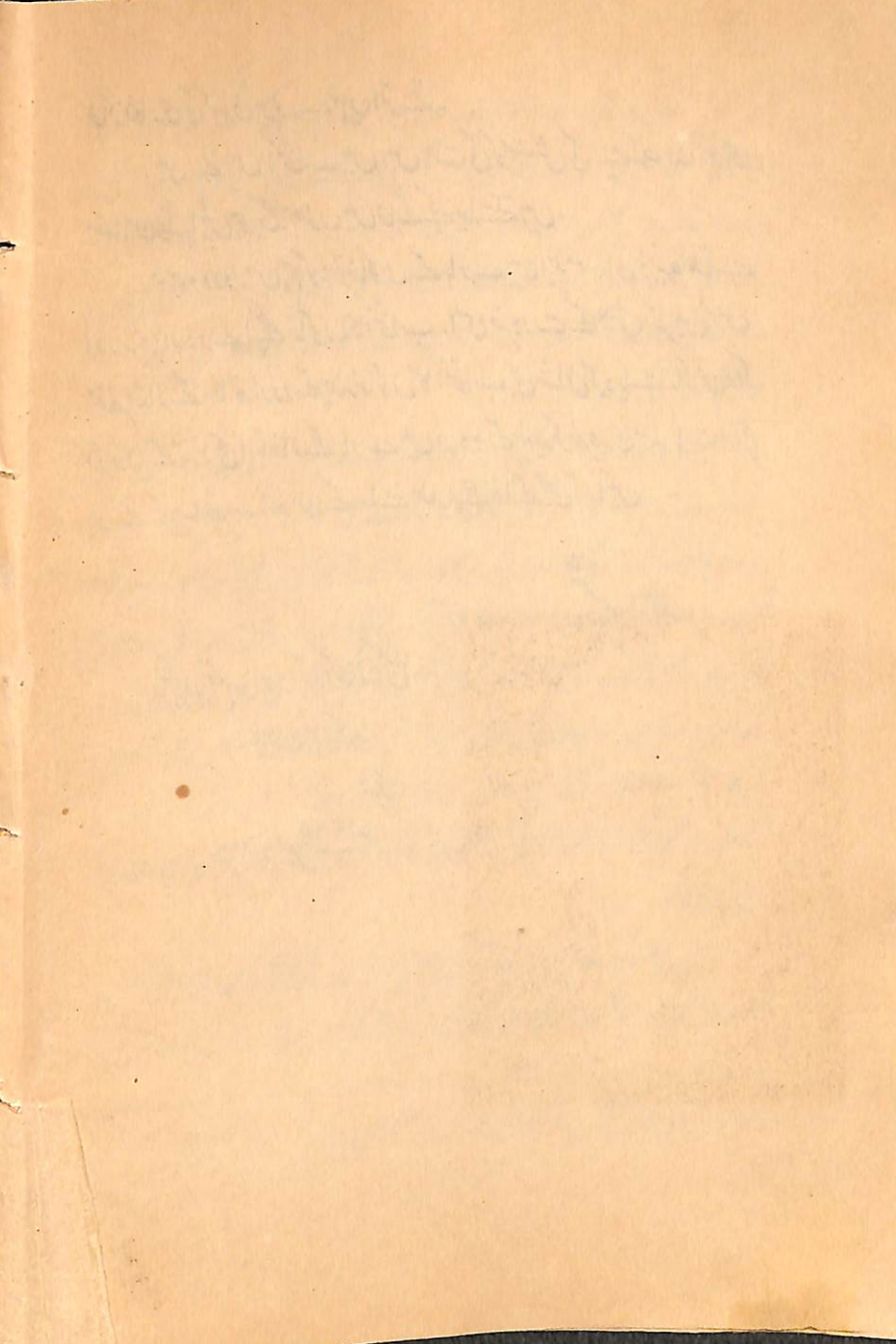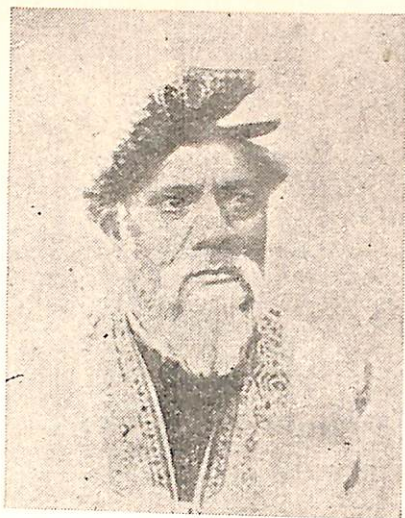
ڈپٹی نذیر احمد

فرحت اللہ بیگ
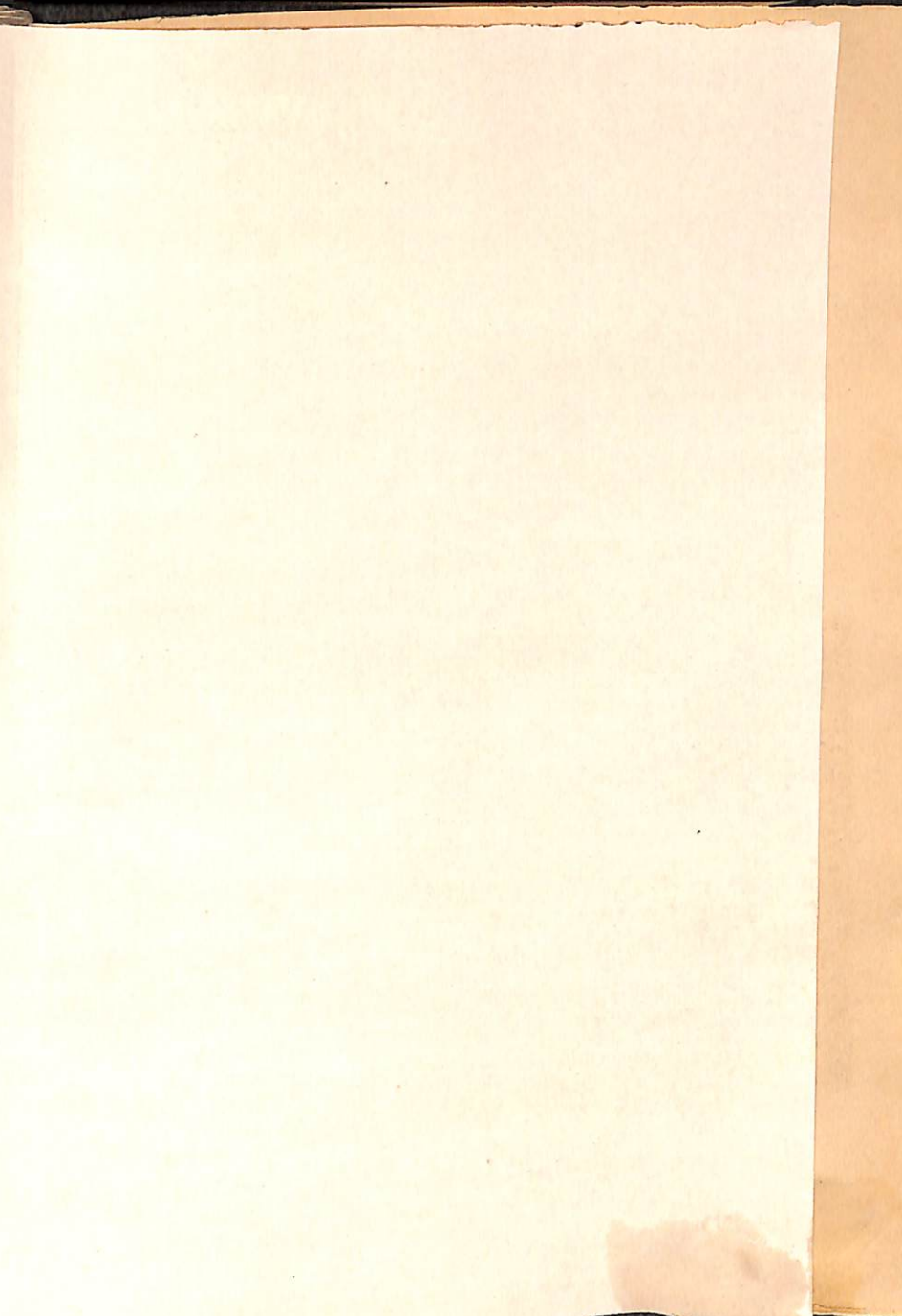
مرزا فرحت اللہ بیگ

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلی کے رہنے والے تھے۔ ستمبر ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوئے اور ۲۷ اپریل ۱۹۴۷ء کو حیدر آباد میں انتقال فرمایا۔

فرحت اللہ بیگ کا رنگ نہایت سرخ و سفید جلد صاف، ہونٹ ورقی، دانت چھوٹے اور پیوستہ، چہرہ نہ لمبا نہ زیادہ گول، آنکھیں البتہ چھوٹی چھوٹی تھیں۔ لڑکپن میں بہت دبلے تھے مگر آخر عمر میں ان کا پیٹ ذرا بڑھ گیا تھا۔

فرحت اللہ بیگ کا خاندان شاہ عالم ثانی کے زمانے میں ترکستان سے ہندوستان آیا۔ ابتدائی تعلیم اسلامی طرز پر ہوئی۔ ۱۹۰۱ء میں ہندو کالج میں داخل ہوئے اور انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد سینٹ اسٹفنس کالج چلے گئے جہاں سے انھوں نے بی۔ اے پاس کیا۔

۱۹۰۷ء میں دہلی سے حیدر آباد گئے اور مولوی عزیز مرزا مرحوم کی توجہ سے ہیڈ ماسٹری کی جگہ ملی۔ محکمۂ تعلیمات میں تھوڑے ہی دن رہے، بعد کو ہائی کورٹ کے مترجم مقرر ہوئے اور رفتہ رفتہ اپنی قابلیت اور محنت سے نائب معتمد مقرر ہوئے۔ بعد ازاں عدالت عالیہ کی معتمدی پر فائز ہوئے، کچھ عرصہ بعد سشن جج ہو گئے اور گلبرگہ میں تعیناتی ہوئی۔ گلبرگہ کے قیام میں مرزا صاحب پر مذہبی رنگ غالب آیا اور آخر

دم تک مذہبی مراسم پابندی سے ادا کرتے رہے۔ گلبرگہ سے حیدرآباد انسپکٹنگ آفیسر کے عہدہ پر آئے۔ یہ عہدہ ہائی کورٹ کی ججی کے مماثل ہے۔

علمی وادبی ذوق انھیں اپنے اجداد سے ورثہ میں ملا تھا جسے اُن کی ذاتی صلاحیات نے غیر معمولی فروغ دیا۔

فرحت اللہ بیگ کے طرزِ تحریر کے بارے میں مولوی عبدالحق کی رائے نہایت جامع ہے۔ انھوں نے لکھا ہے :-

"ادائے مطلب کے بہت سے ڈھنگ ہوتے ہیں اور جیسا جسکا مزاج ہوتا ہے اسی کا اسلوب بیان ہوتا ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کا طرزِ تحریر بھی انکی طبیعت سے ملتا جلتا ہے۔ بیان سادہ ہے۔ تصنّع نام کو نہیں۔ ٹھیٹھ دِلّی کی زبان لکھتے ہیں۔ تحریر میں شوخی بھی ہے اور ظرافت کی چاشنی بھی۔ مرزا صاحب کو فنِ مصوّری میں بھی دخل ہے اسی لئے ان کی نظر چیزوں کے مختلف پہلوؤں پر، کھلے ہوں یا ڈھکے ہوں، وہیں پڑتی ہے جہاں نکتے کی بات ہوتی ہے جس سے عام نظریں سرسری طور سے گذر جاتی ہیں۔ ان کی اس نظر کی بدولت مضمون میں جان پڑتی ہے اور ان کا قلم خط و خال درست کرکے ایک اور رنگینی پیدا کر دیتا ہے۔"

"نذیر احمد کی کہانی" کو فرحت اللہ بیگ کے فن کی معراج اور ان کے قدرتِ بیان کا اعلیٰ ترین نمونہ کہا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی

کچھ میری

اور

کچھ اُن کی زبانی
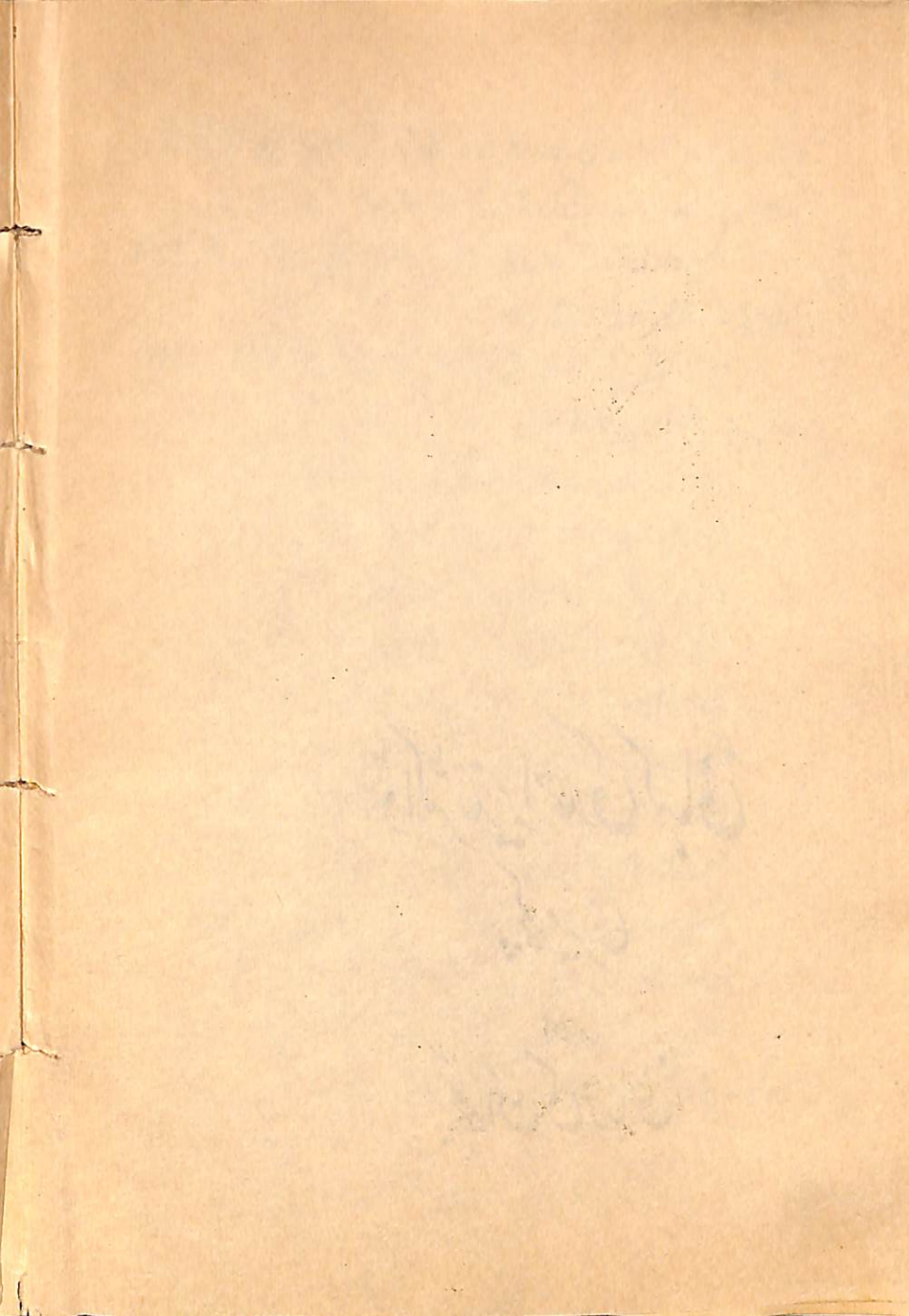
اللہ اللہ ایک وہ زمانہ تھا کہ میں اور دانی[1] مولوی صاحب مرحوم کی باتیں سنتے تھے۔ اُن کی ہمت ہماری ہمت بڑھاتی تھی۔ اُن کا طرزِ بیان ہماری تحریر کا رہبر ہوتا تھا۔ ان کی خوش مذاقی خود ان کو ہنساتی اور ہمارے پیٹ میں بل ڈالتی تھی۔ انکی تکلیفیں خود ان کو پُرنم اور ہم کو تڑپاتی تھیں۔ اور آج وہ دن ہے کہ اُن کے حالات زبانِ قلم پہ لانے سے ڈر لگتا ہے، وجہ یہ ہے کہ وہ بزرگ ہستی "اخوتِ اسلامی" کا سبق پڑھے ہوئے تھی اس کو اپنے بل بوتے پر ترقی کرنے پر ناز تھا، وہ چھوٹے درجہ سے بڑے درجہ پر ترقی کرنا اپنا کارنامہ سمجھتے تھے، اس نے جو کچھ کیا اور جو کچھ کر دکھایا، وہ کسی کی خوشامد کسی کی سفارش یا کسی خاندانی وجاہت کے باعث نہ تھا۔ وہ تھا اور دنیا کا وسیع اکھاڑہ۔ وہ اپنے دست و بازو کے بھروسہ پر اس میدان میں اُترا، ہر مصیبت کا سامنا اپنی ذاتی قابلیت و ہمت سے کیا۔ جس کام میں ہاتھ ڈالا اس کی تکمیل میں خون پانی ایک کر دیا اور دنیا پر بخوبی ثابت کر دیا کہ بے یاری و مددگاری ترقی کی راہ میں ایسی رکاوٹیں نہیں ہیں جو آسانی

---

[1] ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب مرحوم

ہٹائی نہ جاسکیں اور خاندانی تعلقات کی عدم موجودگی ایسی چیز نہیں ہے جو مانع ترقی ہوسکے جب کبھی جوش میں آتے تو ہمیشہ I AM A SELF MADE MAN کا فقرہ ضرور استعمال کرتے اور جب کبھی اس پہلو پر نصیحت کرتے تو ہمیشہ یہی فرماتے کہ بیٹا جو کچھ کرنا ہے خود کرو، باپ دادا کی ہڈیوں کے واسطے سے بھیک نہ مانگتے پھرو۔

انسان فطرت سے مجبور ہے جب دنیا کی نظریں اس پر پڑنے لگتی ہیں تو وہ ہمیشہ اپنی پہلی حالت کی کمزوریوں کو چھپاتا اور خوبیوں کو دکھاتا ہے، جس طرح بڑے بڑے گھرانوں کی نااہل اولاد اپنے باپ دادا کے نام سے اپنی نالائقی کو چھپاتی ہے اسی طرح غریب گھرانوں کی لائق اولاد چاہتی ہے کہ ان کے باپ دادا کے نام لوگوں کے دلوں سے محو ہو جائیں یہ ہے ہماری اخلاقی کمزوری اور یہ ہے ہماری اسلامی سبق سے بے خبری۔ ایک مولوی نذیر احمد خاں تھے جو اپنے آباؤ اجداد کا نقشہ اصلی رنگ میں دکھاتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے، ان کو اپنی ابتدائی غربت پر ناز تھا اور اکثر کہا کرتے تھے "میاں اگر لفٹنٹ گورنر کے بیٹے ہو تو کم سے کم ڈپٹی کمشنر تو ہو جاؤ، دس روپیہ کے اہلکار ہو کر باپ کو لفٹنٹ گورنر کہتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی "

بہر حال یہ فطرت انسانی کا خیال تھا جس نے اب تک مجھے مولوی صاحب مرحوم کے حالات لکھنے سے روکا، بہت کچھ لکھ لیا تھا، وہ پھاڑ ڈالا کہ کہیں اینچن چھوڑ گھسیٹن میں نہ پڑ جاؤں لیکن رہ رہ کر جوش آتا تھا اور ٹھنڈا پڑ جاتا تھا۔ خدا بھلا کرے مولوی عبدالحق صاحب کا کہ انھوں نے مجھے اس اگر مگر سے نکالا اور دل کی باتوں کو حوالۂ قلم کرنے پر آمادہ کر دیا۔ اب جو کچھ کانوں سے سنا اور آنکھوں سے دیکھا ہے وہ لکھوں گا اور بے دھڑک لکھوں گا خواہ کوئی بُرا مانے یا بھلا۔ جہاں مولوی صاحب

مرحوم کی خوبیاں دکھاؤں گا وہاں ان کی کمزوریوں کو بھی ظاہر کروں گا تاکہ اس مرحوم کی اصلی اور جیتی جاگتی تصویر کھنچ جائے اور یہ چند صفحات ایسی سوانح عمری نہ بن جائیں جو کسی کے خوش کرنے یا جلانے کو لکھی گئی ہو۔ میں واقعات کے بیان کرنے میں کوئی سلسلہ بھی قائم نہ کروں گا کیونکہ یہ بناوٹ کی صورت ہے۔ جس موقعہ پر جو کچھ سنا یا دیکھا اس کو جوں کا توں لکھ دوں گا اور ہمیشہ اس امر کی کوشش کروں گا کہ جہاں تک ممکن ہو واقعات مولوی صاحب ہی کی زبان میں بیان کئے جائیں۔ انشاءاللہ واقعات کے اظہار میں مجھ سے غلطی نہ ہوگی۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ بعض نام بھول جانے کی وجہ سے چھوڑ جاؤں یا غلط لکھ جاؤں۔ اب رہا سچ یا جھوٹ تو اس کی مجھے پروا نہیں میں اپنے محترم استاد کے حالات لکھ رہا ہوں، اگر سچ ہیں تو میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں، اگر جھوٹ ہیں تو وہ خود میدان حشر میں سود در سود لگا کر تاوان وصول کریں گے۔

اب رہا طرز بیان تو میں اس میں متانت کو بالائے طاق رکھ دیتا ہوں کیونکہ مولوی صاحب جیسے خوش مذاق آدمی کے حالات لکھنے میں متانت کو دخل دینا ان کا منہ چڑانا ہی نہیں ان کی توہین کرنا ہے بلکہ یوں کہو سید انشا کو میر اور مارک ٹوئین کو امرسن بنانا ہے۔ جب اپنی زندگی میں انھوں نے میری شوخ چشمی کی ہنس ہنس کر داد دی تو کوئی وجہ نہیں کہ اب وہ اپنی وضع داری کو بدل دیں اور میری صاف گوئی کو گستاخی قرار دے کر دعوے دار ہوں۔

چل رے خامہ بسم اللہ

سنہ ۱۹۰۳ء میں، میں نے اور میاں دانی نے، ہندو کالج دہلی سے ایف۔ اے کا امتحان پاس کیا اور دونوں مشن کالج میں داخل ہو گئے۔ ایف۔ اے میں میرا مضمون اختیاری سائنس اور دانی کا عربی تھا، انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ بی اے میں عربی لے لو۔ دونوں کو ایک دوسرے سے مدد ملے گی اور امتحان کی تیاری میں سہولت ہو گی مجھے اپنے حافظہ پر گھمنڈ تھا۔ یہ بھی نہ سمجھا کہ اس مضمون کو سنبھال بھی سکوں گا یا نہیں، جھٹ راضی ہو گیا۔ القصہ ہم دونوں بی۔ اے کے درجۂ ابتدائی میں شریک ہو گئے۔ ہمارے عربی کے پروفیسر مولوی جمیل الرحمٰن صاحب تھے، بڑے اللہ والے لوگ تھے۔ عربی کا گھنٹہ بآسانی تصوّف کی باتوں میں گذر جاتا تھا، کچھ تھوڑا بہت پڑھ بھی لیتے تھے۔ دانی کچھ سمجھتے ہوں تو سمجھتے ہوں کمترین تو طوطے کی طرح حفظ کر لیتا تھا۔ اب رہی صرف و نحو تو اس میں تو کورا کا کورا ہی رہا سنتے آئے ہیں کہ "مصیبت کہہ کر نہیں آتی" لیکن یہ نہیں سنا تھا کہ "عربی کے پروفیسر کہہ کر نہیں جاتے"۔ ایک دن جو مولوی صاحب کے کمرے میں ہم دونوں پہنچے تو دیکھا کہ کمرہ خالی ہے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کل شام کو استعفا دے کر کعبۃ اللہ چلے گئے۔ پرنسپل صاحب کے پاس پہنچے، ان سے پوچھا کہ دوسرے صاحب کب آتے ہیں، تو انھوں نے کورا جواب دے دیا کہ ہم عربی کی جماعت کا بندوبست نہیں کر سکتے بہتر یہ ہے کہ مضمون تبدیل کر لو۔ میں نے دانی سے کہا کہ بھئی تمہارے کہنے سے میں نے عربی لی تھی۔ اب میرے کہنے سے تم سائنس لے لو جس سہولت کی بنا پر تم نے میرا مضمون بدلوایا

تھا۔ اب اسی سہولت کے مدِّنظر اپنا مضمون بدلو، بقول شخصے کہ "مرتا کیا نہ کرتا"، وہ راضی ہو گئے
دفتر میں جا کر جو لکچروں کا حساب کیا تو معلوم ہوا کہ مضمون تبدیل کرنے کا وقت نہیں رہا۔
لکچر کم رہ جائیں گے اور اس طرح بجائے دو سال کے تین سال میں شریکِ امتحان ہونا
پڑے گا" سنگ آمد و سخت آمد" جب "وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے"
کی صورت آن پڑی تو دوسرے ٹھکانے کی تلاش ہوئی، دونوں سر ملا کر بیٹھے مشورے کئے،
ریزولیوشن پاس ہوئے۔ آخر یہ تجویز پاس ہوئی کہ "خاک از تودۂ کلاں بردار" کے مقولے
پر عمل کر کے کسی زبردست مولوی کو گھیرنا چاہیئے، دلّی میں دو تین بڑے عربی داں مانے
جاتے تھے۔ ایک مولوی محمد اسحٰق صاحب، دوسرے شمس العلماء مولوی ضیاء الدین خاں
صاحب ایل۔ ایل۔ ڈی، اور تیسرے مولوی نذیر احمد خاں صاحب۔ پہلے کو تو دیوانگی
سے فرصت نہ تھی اس لئے وہاں تو دال گلتی معلوم نہیں ہوئی، قرعہ دوسرے صاحب
کے نام پر پڑا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا، مولوی ضیاء الدین صاحب جامع مسجد دہلی میں
رات کے دس گیارہ بجے تک بیٹھے وظیفہ پڑھا کرتے تھے۔ ہم دونوں نے بھی جا کر شام
ہی سے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ڈیرے ڈال دیئے۔ آٹھ بجے، نو بجے، دس بج گئے،
مولوی صاحب نہ آج نکلتے ہیں نہ کل۔ خدا خدا کر کے دروازے سے قندیل نکلتی ہوئی معلوم
ہوئی۔ ہم دونوں بھی ہاتھ پاؤں جھٹک کر خوشامد کے فقرے سوچ کھڑے ہو گئے
ہم آخری سیڑھیوں پر کھڑے تھے اس لئے دروازے میں سے پہلے قندیل نکلتی نظر آئی،
اس کے بعد جس طرح سمندر کے کنارے سے جہاز آتا دکھائی دیتا ہے اسی طرح پہلے
مولوی صاحب کا عمامہ، اس کے بعد ان کا نورانی چہرہ، سرگیں آنکھیں، سفید ریشِ
مبارک، سفید جبّہ اور سب سے آخر زردبانات کی سلیم شاہی جوتیاں نظر آئیں، آہستہ

آہستہ انھوں نے سیڑھیوں سے اترنا اور ادھر تلے ہمارے سانس نے چڑھنا شروع کیا۔ ہم سوچتے ہی رہے کہ راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں وہ سٹ سے پاس سے نکل گئے۔ آخر ذرا تیز قدم چل کر ان کو جا لیا اور نہایت ادب سے دونوں نے جھک کر فرشی سلام کیا۔ وہ سمجھے کوئی راہ گیر ہیں میری وجاہت کی وجہ سے سلام کر رہے ہیں۔ یہ نہ سمجھے کہ سائل ہیں، ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہے۔ وہ تو سلام لیتے ہوئے آگے بڑھے اور ہم نے وہی پہلے والی ترکیب کی کہ چکر کھا کر پھر سامنے آگئے۔ یہ دیکھ کر وہ ذرا ٹھٹکے پوچھا "میں نے آپ صاحبوں کو نہیں پہچانا، کیا مجھ سے کوئی کام ہے؟" ہم رام کہانی بیان کر کے عرض مدعا زبان پر لائے، فرمانے لگے "تم کو معلوم ہے کہ میں پنجاب یونیورسٹی کا ممتحن ہوں"۔ بجنسہ اسی لہجے میں یہ الفاظ ادا کیے جیسے اس زمانے میں کوئی کہے "تم کو معلوم ہے کہ میں سی۔ آئی۔ ڈی کا انسپکٹر ہوں"۔ لیکن ہم جان سے ہاتھ دھوئے بیٹھے تھے، عرض کیا کہ ہم امتحان میں رعایت کے طالب نہیں، تعلیم میں مدد چاہتے ہیں، فرمانے لگے کہ "تم کو تعلیم دینا اور پھر ممتحن رہنا میرے ایمان کے خلاف ہے، کسی دوسرے کی تلاش کیجئے"، ممکن ہے کہ یہ مسئلہ کوئی جزو ایمان ہو، ممکن ہے کہ پنجاب یونیورسٹی نے مولوی صاحب سے تعلیم نہ دینے کا حلف لے لیا ہو، بہرحال کچھ بھی ہوا انھوں نے ہم دونوں کو سلام علیکم کا ایک زور سے دھکا دے کر اور نوکر کو حکم دیا کہ آگے بڑھو، وہ حکم کا بندہ قندیل اٹھا آگے چلا اور مولوی صاحب اس کے پیچھے پیچھے لمبے لمبے ڈگ بھرتے روانہ ہوئے، ڈر تھا کہ کہیں یہ دونوں قطاع الطریق پھر راستہ نہ روک لیں، مگر مولوی صاحب کے طرزِ عمل اور سلام علیکم کے جھٹکے نے ہم دونوں کو مضمحل کر دیا تھا جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے کے کھڑے رہ گئے اور مولوی صاحب رہٹ کے کنوئیں کی گلی میں گھس اپنے مکان میں داخل ہو گئے، چلو اُمید

نمبر۲ پر پانی پھر گیا، لیکن آئندہ کے لئے سبق مل گیا کہ ایسے زبردست دشمن پر کھلے میدان میں حملہ کرنا خطرناک ہے ایسے رستم کو پکڑنے کے لئے شغال بننا ضرور ہے۔ وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ کر کونسل ہوئی اور ریزولیوشن پاس ہوا کہ مولوی نذیر احمد صاحب پر حملہ عبدالرحمٰن کی آڑ میں کیا جائے اب میاں عبدالرحمٰن صاحب کا حال بھی سن لیجئے ان کے والد کا نام سراج الدین صاحب تھا۔ نہایت نیک اور پرہیزگار شخص تھے، جوتوں کی دوکان تھی مولوی نذیر احمد صاحب اس دوکان کو ہمیشہ رقمی مدد دیا کرتے تھے اور روزانہ شام کو وہاں آکر بیٹھتے تھے عبدالرحمٰن گو میرے ہم جماعت نہ تھے لیکن آپس میں میل جول بہت تھا۔ مولوی صاحب کو ان کی تعلیم کا بہت خیال تھا، چنانچہ انہی کی وجہ سے عبدالرحمٰن نے بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی کے امتحانات پاس کیے، انہی کی وجہ سے وکالت میں ترقی کی، یہاں تک کہ مولوی صاحب ہی کی دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ اس وقت دہلی میں ان کی ٹکر کا کوئی مسلمان وکیل نہیں ہے۔ اس زمانے میں یہ ایف۔ اے میں پڑھتے تھے۔

بہرحال اسکیم تیار ہوگئی اور دوسرے ہی دن سے میں نے عبدالرحمٰن کو گانٹھنا شروع کیا۔ دو ایک روز کے بعد اُن سے اظہارِ مطلب کیا، کہنے لگے کہ "بھئی مولوی صاحب کو فرصت کم ہے کہیں الکا نہ کر بیٹھیں" میں نے کہا کہ "میاں عبدالرحمٰن تم ان تک ہم کو پہنچا دو اگر ہو سکے تو ایک دو کلمۂ خیر بھی ہمارے حق میں کہدو، آگے ہم جانیں اور ہماری قسمت" وہ راضی ہوگئے اور کہا کہ "شام کو آٹھ بجے دوکان پر آجانا میں مولوی صاحب سے ملوا دوں گا" اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، ٹھیک آٹھ بجے ہم دونوں سراج الدین صاحب کی دوکان پر پہنچے، یہ دوکان فتحپوری کی مسجد کے قریب تھی۔ جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ مولوی صاحب بیٹھے سراج الدین سے کچھ رقم کا حساب کر رہے ہیں۔ ہم نے جاتے ہی فراشی سلام کئے اور خاموش تخت کے کونے

پر بیٹھ گئے۔ سراج الدین صاحب نے خیریت پوچھی، عبدالرحمٰن ہمارے پاس آبیٹھے، مگر مولوی صاحب روپیوں کے حساب کتاب میں اس قدر مشغول تھے کہ انھوں نے دیکھا بھی نہیں کہ کون آیا، کون گیا، میں نے سوچا کہ یہاں بھی معاملہ پٹتا معلوم نہیں ہوتا، دھتکار سن کر یہاں سے بھی نکلنا پڑے گا۔ سچ ہے مایوسی انسان کو ہمت والا بنا دیتی ہے "مرتا کیا نہ کرتا"، میں نے یہی سوچ لیا کہ آج اِس پار یا اس پار۔ مولوی ضیاء الدین صاحب تو بچ کر نکل گئے۔ لیکن مولوی نذیر احمد صاحب سے دو دو ہاتھ ہو جائیں گے۔ قصہ مختصر، مولوی صاحب حساب سے فارغ ہوئے اور پوچھا یہ دونوں صاحب کون ہیں، عبدالرحمٰن نے ہمارے نام بتائے کچھ اُلٹے سیدھے خاندانی حالات بھی بیان کئے۔ اس کے بعد ہماری مصیبت کا بھی ذرا سا تذکرہ کیا اور خاموش ہو گئے۔ میں نے دل میں کہا "پرائے برتے کھیلا جوا، آج نہ موا کل موا۔"

اب میاں عبدالرحمٰن کو رہنے دو، جو کچھ کہنا ہے خود کہہ ڈالو کہیں ایسا نہ ہو کہ یہاں سے بھی بے نیل و مرام باضابطہ پسپائی ہو، میں نے نہایت رقّت آمیز لہجہ میں اپنی مصیبت کا تذکرہ شروع کیا تو فرمانے لگے "تو عربی چھوڑ دو سائنس پڑھو، بیٹیا آجکل مسلمانوں کو سائنس کی بڑی ضرورت ہے، ہمارے ہاں مثل ہے "پڑھیں فارسی بیچیں تیل، یہ دیکھو قدرت کے کھیل"، فارسی پڑھ کر تیل تو بیچ لوگے، عربی پڑھ کر تیل بھی بیچنا نہ آئیگا" ان کی اس پُر مذاق گفتگو سے ہم دونوں کے دل بڑھ گئے، ہم رہنے والے ٹھیرے جامع مسجد کے نیچے کے بھلا ایسی باتوں میں ہم سے کون ور آسکتا ہے۔ ہم نے بھی ایسے ہی شگفتہ الفاظ میں جواب دیا، مولوی صاحب پہلے تو مسکراتے رہے۔ اس کے بعد کھلکھلا کر ہنس دئے۔ دائی کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگے کہ "یہ بڑا غریب معلوم ہوتا ہے مگر تو بڑا بدمعاش ہے۔ بیٹیا

جاؤ کسی دوسرے مولوی صاحب کی تلاش کرو۔ دلّی میں کیا مولویوں کا کال ہے۔ مجھے ذرا بھی فرصت ہوتی تو کبھی انکار نہ کرتا۔" میں نے عرض کی کہ "جناب والا کا ارشاد بالکل صحیح ہے مگر جو مولوی ہیں وہ پڑھاتے نہیں ــــــــــ اور جو پڑھاتے ہیں وہ مولوی نہیں ہیں۔" کہنے لگے "نہیں ایک آدھ ایسا بھی نکل آئے گا جو مولوی بھی ہوگا اور پڑھائے گا بھی۔ جناب شمس العلما، مولوی ضیاء الدین صاحب ایل۔ ایل۔ ڈی (یہ الفاظ بہت طنز سے کہے) کے پاس جاؤ، ان کو فرصت بھی ہے اور عالم بھی ہیں۔" میں نے کہا "اس کے ساتھ وہ پنجاب یونیورسٹی کے ممتحن بھی ہیں۔" کہنے لگے "میں اس کا مطلب نہیں سمجھا" یہاں تو جلے بیٹھے ہی تھے، جامع مسجد کی سیڑھیوں والا واقعہ خوب نمک مرچ لگا کر بیان کیا بہت ہنسے اور کہنے لگے کہ "بھئی تم لونڈوں سے ڈرنا چاہیے ضیاء الدین کو اگر خبر ہو جائے کہ ان کے اوصاف حمیدہ و خصائل پسندیدہ سراج الدین کی دوکان پر اس طرح معرض بحث میں آتے ہیں تو یقین جانو کہ نالش ٹھونک دیں۔ اچھا بھئی میں تم کو پڑھاؤں گا مگر تم بھاگ جاؤ گے"، ہم دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا "نہیں ہرگز نہیں"، مولوی صاحب نے کہا کہ "چھٹی ایک دن کی بھی نہ ہوگی"، ہم نے کہا "بہت خوب"، مولوی صاحب نے کہا کہ "عید بقر عید کو بھی آنا پڑے گا"، ہم نے کہا کہ "بہت مناسب کل کس وقت حاضر ہوں" مولوی صاحب تھوڑی دیر تک انگلیوں پر کچھ اپنے وقت کا حساب کرتے رہے، اس کے بعد کہا "دوپہر کو ڈیڑھ بجے"، ہم نے کہا "بہت خوب" چونکہ ان باتوں میں رات زیادہ ہو گئی تھی۔ اس لئے مولوی صاحب دوکان پر سے اُٹھے ہم سب نے سلام کیا ــــ اور وہ وعلیکم السلام کہتے ہوئے تشریف لے گئے، یہاں میں یہ ضرور کہوں گا کہ سراج الدین صاحب نے وقتاً فوقتاً ہماری ہاں میں ہاں ملا کر اس فیصلے میں بڑی مدد کی، ہم دونوں

بھی خوش خوش اُٹھے اور سلام علیکم و علیکم السلام کر کے دوکان سے چلے۔ راستہ میں دانی نے کہا "میاں مرزا بڑے میاں نے مار ڈالا، بھئی گیارہ بجے کالج سے پڑھ کر نکلیں گے، کشمیری دروازے سے چل کر چوڑی والوں آتے آتے ساڑھے گیارہ بج جائیں گے دم نہ لینے پائیں گے کہ مولوی صاحب کے ہاں چلنے کی تیاری کرنی پڑے گی کہاں چاوڑی اور کہاں کھاری باؤلی، جون کا مہینہ کہیں راستہ میں لو لگ کر ٹیں نہ ہو جائیں" میں نے کہا میاں دانی کچھ دنوں چل کر دیکھو شاید مولوی صاحب کو رحم آجائے مگر ان کو آخر تک رحم نہ آنا تھا نہ آیا۔ لطف یہ ہے کہ جاڑوں میں صبح ساڑھے چھ بجے سے تعلیم کا وقت مقرر ہوا لیکن ایمان کی بات ہے کہ مولوی صاحب ہی کی ہمت تھی کہ وہ ہمارے پڑھانے کو تیار ہو گئے، بے چاروں کا ایک منٹ خالی نہ تھا اور انھوں نے جو وقت ہم کو دیا تھا وہ اپنے آرام کے وقت میں سے کاٹ کر دیا تھا۔ تقریباً دو برس تک ہم ان سے پڑھتے رہے، نہ ہم نے کبھی گرمی یا سردی کی شکایت کی اور نہ کبھی وقت بدلنے کا لفظ زبان پر لائے، نہ ان دو سال میں ایک دن ناغہ کیا، یہاں تک کہ مولوی صاحب بھی ہمیشہ کہتے تھے کہ "بیٹا جب تم دونوں آتے ہو میرا دل خوش ہو جاتا ہے، کیونکہ میں تم میں طالب علمی کی بو پاتا ہوں میں جانتا ہوں کہ تعلیم کس کو کہتے ہیں اور علم کیوں کر حاصل ہوتا ہے، جس طرح ہم نے پڑھا ہے کچھ ہمارا ہی دل جانتا ہے۔ اس زمانے کے لونڈوں پر اگر ایسی بپتا پڑے تو گھر چھوڑ کر بھاگ جائیں مگر (میری طرف دیکھ کر) اُستاد تم سے مجھے کچھ توقع نہیں، تم صرف بی۔ اے پاس کرنے کی فکر میں ہو، دانی کو شوق ہے یہ عربی میں ترقی کرے گا مگر تم کولے کے کورے ہی رہو گے اور انشاءاللہ پانچ چھ ہی برس میں میری ساری محنت اکارت کر دو گے" خدا کے فضل سے ان کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔

اس سے پہلے کہ میں مولوی صاحب کی ابتدائی تعلیم کا ذکر کروں، میں مولوی صاحب کی شکل وصورت، مکان کی حالت، ان کے رہنے سہنے کے طریقے اور اُن کے مشاغل کا نقشہ کھینچ دینا مناسب خیال کرتا ہوں تاکہ مولوی صاحب کے کیرکٹر کا صحیح اندازہ ہوسکے لیکن سینو ٹیٹوگراف کا یہ فلم چڑھانے سے قبل میں اپنے طرزِ بیان کے متعلق معافی مانگ لیتا ہوں، کیونکہ میری شوخی بعض جگہ حدِ تجاوز سے بڑھ جائے گی لیکن آپ تمام قارئین کرام کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر مولوی صاحب خود اپنی سوانح عمری لکھتے تو اسی رنگ میں لکھتے اور اگر آپ ان کی صحبت میں رہے ہوتے تو آپ کو بھی انکے حالات لکھتے وقت میری ہی طرح معافی مانگنی پڑتی، ورنہ آپ کی تحریر بجائے مولوی نذیر احمد صاحب کی سوانح عمری کے کسی ٹھیٹھ ملّا کے بے لطف واقعات کا ایک مجموعہ ہوجاتی، خدا بہتر جانتا ہے کہ اس وقت بھی لکھتے لکھتے پنسل ہاتھ سے رکھ دیتا ہوں اور ایک عالم بیخودی مجھ پر چھا جاتا ہے. مولوی صاحب کی کوئی بات نہ تھی جس میں خوش مذاقی کا پہلو نہ ہو، کوئی قصّہ نہ تھا جس میں ظرافت کوٹ کوٹ کر نہ بھری ہو، کوئی طرزِ بیان نہ تھا جو ہنساتے ہنساتے نہ لٹا دے، وہ دوسروں کو ہنساتے تھے اور چاہتے تھے کہ دوسرے اپنی باتوں سے ان کو ہنسائیں، یہی وجہ تھی کہ ہم (ادرخاص کریں) مولوی صاحب کے سامنے بہت شوخ ہوگئے تھے لیکن وہ طرح ہی نہیں دیتے تھے بلکہ کہا کرتے تھے کہ "مجھے مقطع اور مسمے شاگردوں سے نفرت ہے"۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی صاحب یہ توقع رکھیں کہ میں مولوی صاحب کے حالات متانت کا پہلو اختیار کرکے لکھوں تو میں اس کا صرف یہی جواب دونگا کہ

ہائے کمبخت تونے پی ہی نہیں

لیجئے اب مولوی صاحب کا حلیہ سنئے:۔

رنگ سانولا مگر روکھا۔ قد خاصا اونچا تھا۔ مگر چوڑان نے لمبان کو دبا دیا تھا۔ دوہرا بدن، گدرا ہی نہیں بلکہ موٹاپے کی طرف کسی قدر مائل، فرماتے تھے کہ "بچپن میں ورزش کا شوق تھا، ورزش چھوڑ دینے سے بدن مرمردوں کا تھیلا ہو جاتا ہے" ——

بس یہی کیفیت تھی، بھاری بدن کی وجہ سے چونکہ قد ٹھگنا معلوم ہونے لگا تھا اس لئے اس کا تکملہ اونچی ترکی ٹوپی سے کر دیا جاتا تھا، کمر کا پھیر ضرورت سے زیادہ تھا، توند اس قدر بڑھ گئی تھی کہ گھر میں ازار بند باندھنا بے ضرورت ہی نہیں بلکہ تکلیف دہ سمجھا جاتا تھا اور محض ایک گرہ کو کافی خیال کیا گیا تھا۔ گرمیوں میں تہمد (تہ بند) باندھتے تھے، اس کے پلو اڑسنے کی بجائے اِدھر اُدھر ڈال لیتے تھے مگر اٹھتے وقت بہت احتیاط کرتے تھے، اوّل تو قطب بنے بیٹھے رہتے تھے اگر اٹھنا ہوا تو پہلے اندازہ کرتے تھے کہ فی الحال اٹھنے کو ملتوی کیا جا سکتا ہے یا نہیں، ضرورت نے بہت مجبور کیا تو ازار بند کی گرہ یا تہمد کے کونوں کے اڑسنے کا دباؤ توند پر ڈالتے تھے، سر بہت بڑا مگر بڑی حد تک اس کی صفائی کا انتظام قدرت نے اپنے اختیار میں رکھا تھا، جو تھوڑے سے رہے سہے بال تھے وہ اکثر نہایت احتیاط سے صاف کرا دیئے جاتے تھے، ورنہ بالوں کی یہ گر سفید مقیش کی صورت میں ٹوپی کے کناروں پر جھالر کا نمونہ ہو جاتی تھی، آنکھیں چھوٹی چھوٹی ذرا اندر کو دھنسی ہوئی تھیں، بھوئیں گھنی اور آنکھوں کے اوپر سایہ افگن تھیں، آنکھوں میں غضب کی چمک تھی، وہ چمک نہیں جو غصّہ کے وقت نمودار ہوتی ہے بلکہ یہ وہ چمک تھی جس میں شوخی اور ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری تھی، اگر میں ان کو مسکراتی ہوئی آنکھیں، کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ کلّہ جبڑا زبردست پایا تھا، چونکہ دہانہ بھی بڑا تھا اور پیٹ کے محیط نے سانس کے لئے گنجائش بڑھا دی تھی اس لئے نہایت اونچی آواز میں بغیر سانس

کھنچے بہت کچھ کہہ جاتے تھے، آواز میں گرج تھی مگر لوچ کے ساتھ، کوئی دور سے جو سُنے تو یہ سمجھے کہ مولوی صاحب کسی کو ڈانٹ رہے ہیں لیکن پاس بیٹھنے والا ہنسی کے مارے لوٹ رہا ہو، جوش میں آکر جب آواز بلند کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ترم بج رہا ہی اسی لئے بڑے بڑے جلسوں پر چھا جاتے تھے اور پاس اور دور بیٹھنے والے دونوں کو ایک ایک حرف صاف صاف سنائی دیتا تھا، ناک کسی قدر چھوٹی تھی، اور نتھنے بھاری ایسی ناک کو گنواروں کی اصطلاح میں "گاجر" اور دِلّی والوں کی بول چال میں "پھُلکی" کہا جاتا ہے۔ گو متانت چھو کر نہیں گئی تھی لیکن جسم کے بوجھ نے رفتار میں خود بخود متانت پیدا کردی تھی، ڈاڑھی بہت چھدری تھی، ایک ایک بال بآسانی گِنا جاسکتا تھا کلّے تو کبھی قینچی کے مِنّت کش نہیں ہوئے، البتہ ٹھوڑی پر کا حصّہ کبھی کبھی ہموار کرلیا جاتا تھا۔ داڑھی کی وضع قدرت نے خود فرنچ فیشن بنادی تھی، بالوں میں سے ٹھوڑی اس طرح دکھائی دیتی تھی۔ جیسے اکس ریز (X RAYS) ڈالنے سے کسی بکس کے اندر کی چیز۔ ٹھوڑی چوڑی اور ان کے ارادے کے پکے ہونے کا اظہار کرتی تھی۔ گردن چھوٹی مگر موٹی تھی۔ لیجئے یہ ہیں مولوی نذیر احمد خانصاحب۔

اب رہی لباس کی بحث تو اس کا بھی حال سن لیجئے، جنہوں نے اسٹیج پر ان کو شالی رومال باندھے، کشمیری جبہ یا ایل ایل۔ ڈی کا گون پہنے دیکھا ہے انھوں نے عالی جناب شمس العلمار مولوی، حافظ ڈاکٹر نذیر احمد خاں صاحب ایل۔ ایل، ڈی مدظلہ العالی کو دیکھا ہے، مولوی نذیر احمد صاحب کو نہیں دیکھا، ان کے گھر کے اور باہر کے لباس میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اگر ان کو روزانہ باہر نکلنے کا شوق نہ ہوتا، تو لباس کی مدہی ان کے اخراجات کی فہرست سے نکل جاتی۔ جب شام کو گھر سے نکلتے تو عموماً ترکی ٹوپی یا چھوٹا سفید

صافہ باندھ کر نکلتے تھے، گرمیوں میں نہایت صاف شفاف سفید اچکن اور سفید کرتہ پیجامہ ہوتا اور جاڑوں میں کشمیرے کی اچکن یا کشمیری کام کا جبہ، چونکہ سراج الدین صاحب سے لین دین تھا اس لئے لال نری کا سلیم شاہی جوتا زیادہ استعمال کرتے تھے پھر بھی وقت بے وقت کے لئے دو انگریزی جوڑے لگا رکھے تھے جن پر میری یاد میں پالش ہونے کی کبھی نوبت نہ آئی یہاں تک کہ دونوں سوکھ کر کھڑنک ہو گئے تھے، انہی کا پاؤں تھا کہ ان چینیوں کے سے سخت جوتوں کی برداشت کرتا تھا جرابوں سے انھیں ہمیشہ سے نفرت تھی گو دربار میں جانے کے لئے دو ایک جوڑیاں پاس رہتی تھیں، یہ تو پبلک کے مولوی صاحب ہوئے۔

اب ہمارے مولوی صاحب کو دیکھئے، آئیے میرے ساتھ چوڑی والوں سے چلیئے چوڑی والوں سے نکل کر چاوڑی میں آئیے، الٹے ہاتھ کو مڑ کر قاضی کے حوض پر سے ہوتے ہوئے سرکی والوں سے گزر کر لال کنویں پہنچیے، آگے بڑھئے تو بڑیوں کا کٹرہ ہے وہاں سے آگے چل کر نئے بانس میں آئیے، یہ سیدھا راستہ کھاری باؤلی کو نکل گیا ہے۔ نکڑ سے ذرا ادھر ہی دائیں ہاتھ کو ایک گلی مڑی ہے، یہ بتاشے والوں کی گلی ہے، بتاشے بنتے ہوئے ہم نے سب سے پہلے یہیں دیکھے، یہاں اچار چٹنیوں والوں کی بیسیوں دوکانیں ہیں انہی دوکانوں کے بیچ میں سے ایک گلی سیدھے ہاتھ کو مڑی ہے، تھوڑی ہی دور جاکر بائیں طرف ایک پتلی سی گلی اس میں سے کٹ گئی ہے۔ اس گلی میں پہلا ہی مکان مولوی صاحب کا ہے۔ مکان دو منزلہ ہے اور نیا بنا ہوا ہے، صفائی کی یہ حالت ہے کہ تنکا پڑا نظر نہیں آتا، دروازے کے باہر دونوں پہلوؤں میں دو سنگین چوکیاں ہیں، دروازے کو عبور کرنے کے بعد صحن میں آتے ہیں، صحن کسی قدر چھوٹا ہے، سیدھی طرف دفتر ہے جہاں اکثر دو

تین آدمی بیٹھے ہوئے کلام مجید پڑھا کیا کرتے ہیں اس کے مقابل بائیں طرف باورچی خانہ ہے: چولہے بنے ہوئے ہیں آگ جل رہی ہے مگر برتن اور ہنڈیاں وغیرہ جو باورچی خانہ کا جزو لاینفک ہیں سرے سے ندارد ہیں، آگ صرف حقہ کے لئے سلگائی جاتی ہے کھانا دوسرے گھر سے پک کر آتا ہے، دروازے کے بالکل سامنے اکہرا دالان ہے اور اندر ایک لمبا کمرا، گرمی کا موسم ہے اور مولوی صاحب ایک چھوٹی سی میز کے سامنے بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں کمرے کے دروازے بند ہیں، ایک کھلا ہے، باہر ایک بڑھیا پھونس چماری بیٹھی پنکھے کی رسی کھینچ رہی ہے، ہاں تو میں کیا تصویر دکھانا چاہتا تھا؟ مولوی صاحب کا لباس، مگر خدا کے فضل سے ان کے جسم پر کوئی لباس ہی نہیں ہے جس کا تذکرہ کیا جائے، نہ کرتہ ہے نہ ٹوپی نہ پیجامہ، ایک چھوٹی سی تہمد برائے نام کمر سے بندھی ہوئی ہے، بندھی ہوئی نہیں محض لپٹی ہوئی ہے لیکن گرہ کے جنجال سے بے نیاز ہے، کمرے میں نہایت اجلی چاندنی کا فرش ہے ایک طرف پلنگ بچھا ہوا ہے کبھی اس پر چادر ہے کبھی نہیں ہے، سرہانے تکیہ رکھا ہے مگر اس کی رنگت کا بیان احاطۂ تحریر سے باہر ہے، البتہ جس گاؤ تکیے سے مولوی صاحب لگے بیٹھے ہیں وہ بہت صاف ہے، قالین بھی عمدہ اور قیمتی ہے، اگر مولوی صاحب کی حالت دیکھ کر آپ سوال کر بیٹھیں کہ "مولانا ایں چہ کار ست کہ کردہ"، تو انشاء اللہ یہی جواب ملے گا کہ "محتسب را درون خانہ چہ کار"، جاڑوں میں مکان کے اوپر کے حصہ میں رہتے تھے، چلئے وہاں کا رنگ بھی دکھاؤں، صدر دروازہ سے ملا ہوا زینہ ہے اور سیڑھیوں کے ختم ہونے پر غسل خانہ اور بیت الخلا ہے، اس کے بعد ایک دروازہ آتا ہے، دروازے سے گذر کے چھت پر آتے ہیں، سامنے ہی ایک کمرہ ہے اور اس کے دونوں جانب کوٹھریاں، غسل خانہ کے بالکل مقابل دوسری طرف ایک چھوٹا سا کمرہ ہے۔ آخر میں مولوی صاحب یہیں رہا کرتے تھے

جس زمانے میں ہم پڑھتے تھے تو ان کی نشست سامنے والے بڑے کمرے میں تھی، یہاں بھی چاندی کا فرش ہے، اس پر قالین، پیچھے گاؤ تکیہ، سامنے ایک چھوٹی نیچی میز، پہلو میں حقّہ، اس کی حقیقت کما حقّہ بیان کرنا مشکل ہے۔ مولوی صاحب کو حقّہ کا بہت شوق تھا، مگر تمباکو ایسا کڑوا پیتے تھے کہ اس کے دھوئیں کی کڑواہٹ بیٹھنے والوں کے حلق میں پھندا ڈال دیتی تھی، فرشی قیمتی تھی، مگر چلم پیسہ کی دو والی، اور نیچہ تو خدا کی پناہ، اس کے تیار ہونے کی تاریخ لوگوں کے دلوں سے مدت کی محو ہو چکی تھی، ایک آدھ دفعہ ایک صاحب نے نیچہ بدلنے کا ارادہ بھی کیا، مگر مولوی صاحب نے نیچے کو جورو کا مترادف قرار دے کر ایسا سخت فقرہ کسا کہ بے چارے ٹھنڈے ہو کر رہ گئے۔ خیر جاڑے کا موسم ہے، مولوی صاحب بیٹھے حقہ پی رہے ہیں اور پڑھا رہے ہیں، سر پر کنٹوپ ہے، مگر بڑا دقیانوسی، کبھی کانوں کو ڈھکے ہوئے اور ڈوریاں لٹکتی ہوئیں، کبھی اس کے دونوں پاکھے اوپر کی طرف سیدھے کھڑے ہو کر لاٹ پادری کی ٹوپی کا نمونہ بن جاتے اور ڈوریاں طرّے کا کام دیتیں، کبھی پاکھوں کو سر پر اوپر تلے ڈوریوں سے کس دیا جاتا اور اس طرح کنٹوپ فلیٹ کیپ کی شکل اختیار کر لیتا، جسم پر روئی کی مرزئی مگر ایسی پرانی کہ اس کی روئی کی گرمی مدت سے مائل بہ سردی ہو چکی ہے اور پر صندلی رنگ کا ڈھسّہ پڑا ہوا، لیجیے دیکھا آپ نے ہمارے مولوی صاحب کو؟ چار بجے اور مولوی صاحب نے آواز دی "پانی تیار ہے؟" جواب ملا "جی ہاں" مولوی صاحب غسلخانہ میں گئے کپڑے بدل دیا یوں کہو کہ جون بدل باہر نکل آئے اور چلے ٹاؤن ہال کو، لیجیے اب یہ ہمارے مولوی صاحب نہیں رہے، آپ کے مولوی صاحب ہو گئے۔

گھر میں اس لباس سے استتار کے کئی باعث تھے، اوّل تو یہ بات تھی کہ ان

کو اپنے کاموں ہی سے فرصت نہیں تھی۔ پڑھنے پڑھانے اور لکھنے لکھانے میں ان کا سارا دن گذر جاتا تھا، دوسرے یہ کہ وہ بہت کم لوگوں سے مکان پر ملتے تھے جس کو ملنا ہوتا تھا شام کو ٹاؤن ہال کی لائبریری میں جاکر ان سے مل آتا تھا، جو لوگ مکان پر آتے تھے وہ یا تو ان کے شاگرد ہوتے تھے یا خود صاحبِ کمال، اور ظاہر ہے ایسے صاحبِ کمال لوگ ظاہری حالت کو نہیں دیکھتے، یہ دیکھتے ہیں کہ مولوی صاحب ہیں کتنے پانی میں، لباس سے اس بے اعتنائی کی تیسری وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے گھر کو اپنا گھر سمجھتے تھے، کسی دوسرے کا دولت خانہ نہیں جانتے تھے۔ ان کو جس طرح آرام آتا اسی طرح رہتے۔ جی چاہتا پہنتے نہ جی چاہتا نہ پہنتے، البتہ جب باہر جاتے تو "کھائے من بھاتا، پہنے جگ بھاتا" پر عمل کرتے، اصل عالِم تو گھر پہ تھے، باہر نکل کر ظاہری عالِم بن جاتے۔ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ گھر پر کوئی عورت نہ تھی جو ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھتی یا کم سے کم اُن کا کنٹوپ، مرزئی یا سرہانے کے تکیہ کا غلاف تو بدل دیا کرتی، گھر میں تھا کون، ایک مولوی صاحب، دوسرا ایک کائٹرا ٹٹو بدھو نفر، ان کا نوکر خدا بخش، وہ بھی ایسا بے پروا کہ خدا کی پناہ، ظالم نے بہرا بن کر کام سے اور اپنا پیچھا چھڑا لیا تھا، مولوی صاحب کی آواز جس سے مردے قبر میں چونک پڑیں اس کو کبھی نہ سنائی دی، اور جب تک کسی نے جاکر اس کا شانہ نہ ہلایا، اس نے ہمیشہ سنی کو ان سُنی کر دیا، البتہ حقّے کے معاملہ میں بڑا تیز تھا، یا تو اس کو یہ خیال تھا کہ حقّے بغیر مولوی صاحب کے ہاں گزارہ ہونا دشوار ہے یا یہ وجہ تھی کہ تمباکو زیادہ صرف کرنے میں اس کو دو ایک پیسے روز مل جاتے تھے بغرض یہ حال تھا کہ حقّہ پورا سلگا بھی نہیں کہ وہ چلم اٹھا کر چلا، مولوی صاحب ہاں ہاں کرتے ہی رہے اس نے جا چلم الٹ دی دوسرا سلفہ رکھ، آگ بھر، چلم حقہ پر لا کر رکھ دی، تو

گرم حقّہ بھڑک گیا، میاں نوکر صاحب کو پھر بلا کر تو ا ٹھنڈا کرنے اور چلم بھروانے کی ضرورت پیش آئی، غرض سارے دن ان کا یہی کام تھا اور وہ اس میں بہت خوش اور مگن تھے

جرمنی کے مشہور فلسفی کانٹ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ وقت کا اس قدر پابند تھا کہ لوگ اس کو دیکھ کر اپنی گھڑیاں ٹھیک کر لیتے تھے، بعض یورپ پرست اس کی پابندیٔ اوقات کو یورپ والوں کا ہی حصّہ خیال کریں تو خیال کریں میں تو یہ کہتا ہوں کہ میں نے صرف دہلی میں تین شخص ایسے دیکھے ہیں کہ آندھی آئے مینھ آئے، روزانہ چھ بجے ٹاؤن ہال کی لائبریری میں آتے تھے، اِدھر انھوں نے لائبریری کے دروازے میں قدم رکھا اور اُدھر گھنٹہ گھر نے ٹن ٹن چھ بجائے۔ لطف یہ ہے کہ اُن میں سے ایک مشرق میں رہتا تھا تو دوسرا مغرب میں۔ یہ تین شخص کون تھے ؟ ایک منشی ذکاء اللہ صاحب، دوسرے امیر بہادر پیارے لال صاحب اور تیسرے مولوی صاحب، ایک چیلوں کے کوچہ سے آتا ہے، دوسرا دریبہ سے اور تیسرا کھاری باؤلی سے، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ایک نے آ کر دوسرے کا انتظار کیا ہو، اگر ان میں سے کوئی نہ آتا تھا تو ایک ہی نتیجہ نکل سکتا تھا کہ نہ آنے والا ایسا بیمار ہے کہ چلنا دشوار ہے اور یہ نتیجہ کبھی غلط ثابت نہیں ہوا، میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سُنا ہے کہ اگر کسی شخص کو ان تینوں میں سے کسی سے ملنا ہوتا اور چھ بجے سے ذرا پہلے لائبریری کے کسی ملازم سے جا کر دریافت کرتا تو یہی جواب ملتا کہ اب آتے ہی ہوں گے چھ میں دو ہی منٹ تو رہ گئے ہیں، دوسرے دو صاحبوں کا ٹائم ٹیبل تو مجھے معلوم نہیں، البتہ مولوی صاحب کی مصروفیتوں کا حال لکھتا ہوں۔ ان کے اس نظامِ اوقات میں گرمی اور جاڑے کے لحاظ سے کچھ کچھ تغیّر ہو جاتا تھا، وہ ہمیشہ بہت سویرے اُٹھنے کے عادی تھے، گرمیوں میں اُٹھتے ہی نہاتے اور ضروریات سے فارغ ہو کر

نماز پڑھتے ان کی صبح اور عصر کی نماز کبھی ناغہ نہ ہوتی تھی، باقی کا حال اللہ کو معلوم ہے
نہ میں نے دریافت کیا اور نہ مجھ سے کسی نے کہا؛ صبح کی نماز پڑھ کر کچھ تلاوت کرتے،
ادھر ذرا دن چڑھا اور مولویوں کی جماعت اور خود مولوی صاحب کا ناشتہ داخل ہوا'
اس جماعت میں بخارا، کابل سرحد وغیرہ کے لوگ تھے۔ ان کی تعداد کوئی ۱۵-۱۶ تھی،
محنت ایسی کرتے تھے کہ کوئی دوسرا کرے تو مر جائے لیکن ٹھوٹھ ایسے تھے کہ مولوی صاحب بھی
ان سے زچ ہو جاتے تھے، خوش مذاقی تو انھیں چھو کر نہیں نکلتی تھی، خود مذاق کرنا تو کجا
دوسرے کا مذاق بھی نہیں سمجھ سکتے تھے، متانت اور ادب کا یہ حال تھا کہ آنکھ اُٹھا کر مولوی صاحب
کو دیکھنا سوءِ ادبی سمجھتے تھے، اب ان کے "وہ عمامے اونچے اونچے، یہ یہ لمبی لمبی ڈاڑھیاں"
دیکھو اور مولوی صاحب کی حالت کا اندازہ کرو، بے چارے ناشتہ کرتے جاتے اور اپنا
فرض اتارتے جاتے تھے، عالم تھے دوسروں کو عالم بناتے تھے، لیکن کہا کرتے تھے کہ ان
فتحپوری کے ملّانوں کو پڑھا کر میرا دل بیٹھ جاتا ہے، کیا کہوں "میں ہوں ہنسوڑا تو ہے مقطع
میرا تیرا میل نہیں"، کا نقشہ ہے، یہ جماعت اُٹھی اور مولوی رحیم بخش آنازل ہوئے،
کاغذوں کا مٹھا بغل میں ہاتھ میں پنسل، کان میں قلم، اِدھر فتحپوری کی جماعت نے کمرے
سے قدم نکالا اور اُدھر انھوں نے کمرہ میں قدم رکھا، اب سلسلۂ تصنیف و تالیف شروع
ہوا چونکہ آخر میں مولوی صاحب کے ہاتھ میں رعشہ آگیا تھا، اس لئے لکھوانے کا کام
اکثر انھیں سے لیا جاتا تھا، سب سے پہلے کلام مجید اور حمائل شریف کی کاپیوں کی
صحت کی جاتی، اس کے بعد مطبع کا حساب دیکھا جاتا اور پھر جدید تصنیفات کا سلسلہ
شروع ہوتا، یہ کام سمیٹتے سمیٹتے ساڑھے گیارہ پونے بارہ بج جاتے، رحیم بخش صاحب
کے اٹھتے ہی کھانا آتا، کھانا کھایا اور پلنگ پر لیٹ گئے، اِدھر ڈیڑھ بجا اور اُدھر ہم

دونوں داخل ہوئے ہمارا قدم رکھنا تھا کہ مولوی صاحب اُٹھ بیٹھے، ساڑھے تین بجے
تک ہم سے سر مغزنی کرتے رہے، اگر کوئی دلچسپ بحث یا قصہ چھڑ گیا تو چار بج گئے۔
چار بجے اور مولوی صاحب غسل خانے میں گئے، نہائے دھوئے کپڑے پہن کر نکل کھڑے
ہوئے۔ پہلے شمس العارفین کی دوکان پر ٹھہرے، یہاں بھی اُن کا حساب کتاب تھا، وہاں
کا کھاتہ دیکھا، جو کچھ لینا دینا تھا لیا دیا اور سیدھے ٹاؤن ہال کی لائبریری میں پہنچ گئے
سات بجے تک وہاں ٹھہرے جس کو ملنا ہوا وہاں مل لیا، سات بجے وہاں سے اُٹھ کر
سراج الدین صاحب کی دوکان پر آئے یہاں بھی حساب کیا، عبدالرحمٰن کو پڑھایا،
گھنٹہ بھر وہاں ٹھہر کر مکان پہنچ گئے، کھانا کھایا، کچھ لکھا پڑھا اور دس بجے سو رہے،
جاڑے میں پروگرام میں تبدیلی ہو جاتی تھی کہ پہلے صبح ہی صبح ہم پہنچتے تھے، اس کے بعد
مولویوں کی جماعت آتی تھی، رحیم بخش صاحب کا نمبر سہ پہر میں آتا تھا۔

خوش خوراک تھے اور مزے لے لے کر کھانا کھاتے تھے، ناشتے میں دو نیم برشت
انڈے ضرور رہتے تھے، میوہ کا بڑا شوق تھا، ناشتہ اور کھانے کے ساتھ میوہ کا ہونا لازم
تھا، پڑھاتے جاتے تھے، اور کھاتے جاتے تھے مگر مجھ کو ایک حسرت رہ گئی کہ کبھی شریک
طعام نہ ہو سکا۔ خیر ان پٹھانوں کی جماعت کی تو کیا صلاح کرتے ان کے لئے تو مولوی صاحب
کا ناشتہ اونٹ کے منہ میں زیرہ ہو جاتا البتہ ہم دونوں کی صلاح نہ کرنا غضب تھا۔
کہتے بھی جاتے تھے "بھئی کیا مزے کا خربوزہ ہے میاں کیا مزہ کا آم ہے" مگر بندۂ خدا نے
کبھی یہ نہ کہا کہ "بیٹا ذرا چکھ کر تو دیکھو یہ کیسا ہے"۔ میں نے تو یہ تہیہ کر لیا تھا (میاں دانی
اب انکار کریں تو کریں لیکن ان کا بھی یہی ارادہ تھا) کہ مولوی صاحب اگر جھوٹے منہ
بھی شریک ہونے کو کہیں تو ہم سچ مچ شریک ہو جائیں۔

مولوی صاحب کو مسلمانوں میں تجارت پھیلانے کا شوق تھا اور اس غرض کے حاصل کرنے میں اُن کو مالی مدد دینے میں کبھی انکار نہ ہوتا تھا۔ بے دریغ روپیہ دیتے تھے اور اکثر بڑی بڑی رقمیں ڈبو بیٹھتے تھے، کہا کرتے تھے "میاں میں سچ کہتا ہوں کہ اس تجارت کے شوق میں تین لاکھ روپیہ کھو بیٹھا ہوں۔ پھر بھی جو کچھ مجھے بعض کھرے دوکانداروں سے فائدہ پہنچا ہے، اس نے میرے نقصان کی تلافی ہی نہیں کر دی بلکہ کچھ نفع ہی پہنچا دیا ہے بیٹا تم بھی تجارت کرو، روپیہ میں دیتا ہوں نوکری کی کھکیڑ اٹھاؤ گے تو مزہ معلوم ہوگا۔" جس طرح روپیہ دل کھول کر دیتے تھے، اسی طرح حساب بھی بڑی سختی سے لیتے تھے۔ گرمی ہو یا جاڑا، دھوپ ہو یا مینہ، قرض داروں کے یہاں ان کا روزانہ چکر نہ چھوٹتا تھا، گئے اور جاتے ہی پہلے "غلق" پر قبضہ کیا، اس کے بعد کھاتہ دیکھا، گروی دیکھی، سامان دیکھ کر بکری کا اندازہ کیا، روپیہ جیب میں ڈالا اسلام علیکم وعلیکم السلام کیا اور چل دیئے۔ دوسرے دوکاندار کے پاس پہنچے اور وہاں بھی وہی پہلا سبق دوہرایا، کوڑی کوڑی کا حساب دیکھتے، اعتراضوں کی بوچھاڑ سے پریشان کرتے اور کہتے جاتے "بھئی حساب جو جو بخشش سو سو" فقرے کے پہلے جزو سے تو بے چاروں کو روز واسطہ پڑتا۔ لیکن دوسرے جزو کا دیکھنا کبھی کسی کو نصیب نہ ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ واقعی بازار کے مندا ہونے یا کسی اور وجہ سے ان کے کسی قرضدار کا نقصان ہو جاتا یا دیوالہ نکل جاتا تو پھر اس قرضے کا ذکر زبان پر نہ لاتے، ان کو خیال تھا کہ دہلی کے پنجابی تجارت کو خوب سمجھتے ہیں ان کو دل کھول کر روپیہ دیتے تھے اور اکثر اُن ہی کے ہاتھوں نقصان اٹھاتے تھے، مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان کرتا ہوں، ایک صاحب جنکا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں مولوی صاحب کے پاس آئے تجارت کا ذکر چھیڑا اور مولوی صاحب کو ولایتی جوتوں کے فائدے کے وہ سبز باغ دکھائے کہ تیسرے ہی روز

بلا کسی طمانیت کے گیارہ ہزار روپیہ کا چک مولوی صاحب نے ان کے نام لکھ دیا بڑے ٹھاٹھ سے سنہری مسجد کے قریب دوکان کھولی گئی۔ مولوی صاحب جاتے گھڑی دو گھڑی وہاں بیٹھتے دوکاندار صاحب کی چھپے دار باتیں سنتے چلتے وقت کچھ روپیہ جیب میں ڈالنے کو مل جاتے اس لئے خوش خوش بغیر حساب کئے گھر آجاتے۔ یہی ٹھوکر تھی جس نے مولوی صاحب کو چوکنّا کردیا تھا اور وہ بغیر حساب کتاب دیکھے روپے کو ہاتھ لگانا گناہ سمجھتے تھے۔

قصّہ مختصر، اصل میں سے دو ڈھائی ہزار روپیہ مولوی صاحب کو تھما اس نے دیوالہ نکال دیا قرقی ہوئی مال نیلام چڑھا اور اس میرے یار نے کُل سامان دوسروں کے ذریعہ سے خود خرید لیا۔ مولوی صاحب کو اس چال کی کانوں کان خبر نہ ہوئی، اس کے بعد آیا، بہت رویا بہت آنسوے بہائے، مولوی صاحب سمجھے بے چارے کو بڑا رنج ہوا، کہا بھئی جاؤ تجارت میں یہی ہوتا ہے یا اس پار یا اُس پار، چلو گئی گذری بات ہوئی۔ ایک روز خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ یہ چاوڑی میں جا رہے تھے کچھ جھٹپٹا ہوا تھا کیا دیکھتے ہیں کہ دوکاندار صاحب خوب بنے ٹھنے، عطر میں بسے، پھولوں کا کنٹھا گلے میں ڈالے، ایک رنڈی کا ہاتھ پکڑے کوٹھے سے اُترے اور آکر ایک کھلی گاڑی میں سوار ہوئے، مولوی صاحب نے جو یہ رنگ دیکھا تو وہیں ٹھٹک گئے۔ اتنے میں انھوں نے بھی مولوی صاحب کو دیکھا، بہت مسکرا کر سلام کیا رنڈی نے چپکے چپکے کچھ دریافت کیا تو ایک قہقہہ لگایا اور اونچی آواز میں کہا کہ ”یہ سب کچھ مولوی صاحب ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے“ مولوی صاحب کے آگ لگ گئی، دوسرے ہی دن نالش ٹھونک دی اور آخر ان کو ٹھکانے لگا کر ہی دم لیا، لوگوں نے سفارشیں بھی کیں، اُنھوں نے خود بھی آکر بہت کچھ توبہ تلّا کی لیکن یہ نہ ماننا تھا، نہ مانے اور آخر جب اس کو کُھک کر دیا اس وقت اُن کو چین آیا۔

دین لین سب کچھ کرتے تھے، مگر حساب کتاب صرف دوسروں کی کتابوں یا ان کے دل میں تھا، کچھ تھوڑا بہت لوگوں کے کہنے سننے سے متفرق پرچوں پر لکھ بھی لیا تھا، لیکن اتنے بڑے بیوپار کے لئے جیسا دفتر چاہئے وہ انھوں نے نہ رکھنا تھا نہ رکھا۔

سود لینا وہ جائز سمجھتے تھے، اگر کوئی حجّت کرتا تو مارے تاویلوں کے اس کا ناطقہ بند کر دیتے، ایک تو حافظ، دوسرے عالم، تیسرے لسّان بھلا ان سے کون ور آسکتا تھا اور تو اور خود مجھ سے سود لینے کو تیار ہو گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم پر متفرق قرضے تھے، خیال آیا کہ ایک جگہ سے قرض لے کر سب کو ادا کر دیا جائے، قرضہ کس سے لیا جائے یہ ذرا ٹیڑھا سوال تھا ہر پھر کر مولوی صاحب ہی پر نظر جاتی تھی۔ آخر ایک دن جی کڑا کر کے میں نے مولوی صاحب سے سوال کر ہی دیا، کہنے لگے "کتنا روپیہ چاہیے" میں نے کہا "بارہ ہزار" بولے "ضمانت" میں نے کہا "چوڑی والوں والا مکان"، پوچھا "کتنی مالیت کا ہے" میں نے کہا "کوئی ساٹھ ستر ہزار روپے کا"، فرمایا "کل قبالہ لیتے آنا"، میں نے دل میں سوچا چلو چھٹی ہوئی، بڑی جلدی معاملہ پٹ گیا۔ دوسرے دن قبالہ لے کر پہنچا، پڑھ کر کہا "ٹھیک ہے، مگر بیٹا سود کیا دو گے" میں نے کہا "مولوی صاحب آپ اور سود" کہنے لگے "کیوں اس میں کیا ہرج ہے، میں نہ دوں گا تو کسی ساہوکار سے لو گے، اس کو خوشی سے سود دو گے، ارے میاں مجھے کچھ فائدہ پہونچاؤ گے تو دین و دنیا دونوں میں بھلا ہو گا، آخر میں تمہارا استاد ہوں یا نہیں، میرا بھی کچھ حق تم پر ہے یا نہیں، جاؤ شاباش بیٹا اپنے چچا سے جا کر تصفیہ کر آؤ، کل ہی چک بنگال بنک کے نام لکھے دیتا ہوں" میں نے کہا "مولوی صاحب لوگ کیا کہیں گے کہ مولوی ہو کر سود لیتے ہیں اور لینے ہیں کس سے کہ اپنے شاگردوں سے" کہنے لگے "اس کی پروا نہ کرو جب مجھ پر کفر کا

فتویٰ لگ چکا ہے تو اب مجھے ڈر ہی کیا رہا، جاؤ تمہارے ساتھ یہ رعایت کرتا ہوں کہ اوروں سے روپیہ سیکڑہ لیتا ہوں، تم سے چودہ آنے لوں گا۔" میں نے آکر گھر میں ذکر کیا ہم کو دوسری جگہ سے آٹھ آنے سیکڑہ پر روپیہ مل گیا اسلئے یہ معاملہ یونہی کا یونہی رہ گیا۔

لیجئے یہ قصّے تو سنا چکا۔ اب اصل کہانی کی طرف رجوع کرتا ہوں اور مولوی صاحب کی ابتدائی تعلیم کے واقعات، جو ان کی زبانی سنے تھے بیان کرتا ہوں۔

ایک دن مولوی صاحب "معلقات" پڑھا رہے تھے، عمرو بن کلثوم کا قصیدہ تھا جب اس شعر پر پہنچے ؎

ابا ہند فلا تعجل علینا وانظرنا نخبرک الیقینا

تو بہت ہنسے کتاب رکھ دی اور ہنستے ہنستے لوٹ گئے، ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ الٰہی یہ ماجرا کیا ہے شعر میں تو کوئی ہنسی کی بات نہیں، پھر مولوی صاحب کو یہ کیا مرض اُٹھا ہے آخر جب ہنسنے کا ذرا زور کم ہوا تو وجہ دریافت کی، مولوی صاحب پھر ہنسنے لگے، تھوڑی دیر کے بعد سنبھل کر بولے، "میاں بعض شعر قصّہ طلب ہوتے ہیں، یہ شعر میری زندگی کے قصّے کا آغاز ہے، اچھا لو سناتا ہوں، مگر پہلے تمہید سن لو، بھئی ہم بہت غریب لوگ تھے نہ کھانے کو روٹی نہ پہننے کو کپڑا، تعلیم کا شوق تھا، اس لئے پھرتا پھراتا پنجابیوں کے کٹڑے کی مسجد میں آکر ٹھہر گیا، یہاں کے مولوی صاحب بڑے عالم تھے، ان سے پڑھتا اور توکّل پر گذارہ کرتا مولوی صاحب کے دو چار شاگرد اور بھی تھے، انھیں بھی پڑھاتے مجھے بھی پڑھاتے، دن رات پڑھنے کے سوا کچھ کام نہ تھا، تھوڑے سے دنوں میں کلام مجید پڑھ کر میں نے ادب پڑھنا شروع کیا، چار پانچ برس میں "معلقات" پڑھنے لگا، گو میری عمر بارہ سال کی تھی مگر قد چھوٹا ہونے کی وجہ سے نو دس برس کا معلوم ہوتا تھا،

پڑھنے کے علاوہ میرا کام روٹیاں سمیٹنا بھی تھا۔ صبح ہوئی ادھر میں ہاتھ میں چھڑی لیکر گھر گھر روٹیاں جمع کرنے نکلا، کسی نے رات کی بچی ہوئی دال ہی دیدی، کسی نے قیمہ کی لگدی ہی رکھ دی، کسی نے دو تین سوکھی روٹیوں ہی پر ٹرخا دیا۔ غرض رنگ برنگ کا کھانا جمع ہو جاتا۔ مسجد کے پاس ہی عبدالخالق صاحب کا مکان تھا اچھے کھاتے پیتے آدمی تھے۔ انھیں کے بیٹے ڈپٹی عبدالحامد ہیں جو سامنے والے مکان میں رہتے تھے، ان کے ہاں میرا قدم رکھنا مشکل تھا۔ اِدھر میں نے دروازے میں قدم رکھا، اُدھر ان کی لڑکی نے ٹانگ لی، جب تک سیر دو سیر مصالحہ مجھ سے نہ پسوا لیتی نہ گھر سے نکلنے دیتی نہ روٹی کا ٹکڑا دیتی خدا جانے کہاں سے محلہ بھر کا مصالحہ اٹھا لاتی تھی، پیستے پیستے ہاتھوں میں رگتے پڑ گئے تھے، جہاں میں نے ہاتھ روکا اور اس نے بٹہ انگلیوں پر مارا، بخدا جان سی نکل جاتی تھی۔ میں نے مولوی صاحب سے کئی دفعہ شکایت بھی کی مگر انھوں نے ٹال دیا۔ خبر نہیں مجھ سے کیا دشمنی تھی، چلتے چلتے تاکید کر دیا کرتے تھے کہ عبدالخالق صاحب کے مکان میں ضرور جانا، بہر حال مارا دھاڑی روز وہاں جانا پڑتا اور روز یہی مصیبت جھیلنی پڑتی، تم سمجھے بھی کہ یہ لڑکی کون تھی میاں یہ لڑکی وہ تھی جو بعد میں ہماری بیگم صاحبہ ہوئیں۔ جب سوچتا ہوں تو پچھلا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے، اور بے اختیار ہنسی آجاتی ہے اکثر ہم دونوں پہلی باتوں کو یاد کرتے اور خوب ہنستے تھے، خدا غریق رحمت کرے جیسی بچپن میں شریر تھیں ویسی ہی جوانی میں غریب ہو گئیں۔ ان کے مرنے کے بعد ہماری تو زندگی کا مزا جاتا رہا، بھئی دیکھنا میں نے بھی کیسی مزے کی تاریخ کہی ہے"۔ اس کے بعد انھوں نے عربی کے چار پانچ اشعار کا قطعہ سنایا، مادۂ تاریخ "لہا غفر" تھا، میں نے بڑی زور سے "اوں ہوں" کی بگڑ کر میری طرف دیکھا اور کہا "کیوں

آپ کو اس پر کچھ اعتراض ہے؟" میں نے عرض کی، "جی نہیں لیکن اس قطعہ کو سنکر مجھے دبیر کی ایک رباعی یاد آگئی۔ فرماتے ہیں ؎

ہم شانِ نجف نہ عرش انور ٹھہرا
میزان میں یہ بھاری وہ سبک تر ٹھہرا
اس پلّے میں تھا نجف اور اس پلّے میں عرش
پہنچا وہ فلک پر یہ زمیں پر ٹھہرا

بڑے غور سے سنتے رہے پھر کہنے لگے" یہ تو بے معنی ہے نجف کی جگہ دنیا کی جس چیز کو رکھ دو اس سے یہ رباعی متعلق ہو جائے گی اور وہ عرش سے بھاری ثابت ہو گی،" میں نے عرض کی کہ" آپ کے قطعہ کو اس سال میں مرنے والی جس عورت سے متعلق کر دو متعلق ہو جائے گا۔ اس تاریخ میں خوبی ہی کیا ہے۔ اوّل تو ایسی عام تاریخیں کچھ قابلِ تعریف نہیں ہوتیں۔ دوسرے سرسیّد کی تاریخ انتقال "غفرلہ" پر آپ نے صرف الف کا اضافہ کر کے اس کو اپنا مال کر لیا ہے۔" مسکرا کر کہنے لگے" اچھا بھئی تو ہی سچا سہی" خیر اب اس جھگڑے کو چھوڑ دو اور میری اصلی کہانی کو لو، ہاں تو فرصت کے وقت ہم دہلی کی گلیوں کا چکر لگاتے کبھی کبھی کشمیری دروازے کی طرف بھی نکل جاتے، ایک روز جو کشمیری دروازے کی طرف گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دہلی کالج میں بڑا ہجوم ہے، کالج وہاں تھا جہاں اب گورنمنٹ اسکول ہے۔ میں بھی بھیڑ میں گھس گیا۔ معلوم ہوا کہ لڑکوں کا امتحان لینے مفتی صدر الدین صاحب آئے ہیں۔ ہم نے کہا چلو ہم بھی دیکھیں، برآمدے میں پہنچا، قد چھوٹا تھا۔ لوگوں کی ٹانگوں میں سے ہوتا ہوا گھس گھا کر کمرے کے دروازے تک پہنچ ہی گیا، دیکھا کہ کمرے کے بیچ میں میز بچھی ہے، اس کے سامنے کرسی پر مفتی صاحب بیٹھے ہیں، ایک ایک لڑکا آتا ہے اس سے سوال کرتے ہیں اور سامنے کاغذ پر کچھ لکھتے جاتے ہیں۔ میز کے دوسرے پہلو کی کرسی پر ایک انگریز بیٹھا ہے۔ یہ مدرسہ کے پرنسپل صاحب تھے ہم تماشے

میں محو تھے کہ صاحب کسی کام کے لئے اٹھے، چپراسیوں نے راستہ صاف کرنا شروع کیا۔ جو دروازہ روکے کھڑے تھے وہ کسی طرح پیچھے نہ ہٹتے تھے، چپراسی زبردستی دھکیل رہے تھے، غرض اس دھکّا پیل میں میرا قلیہ ہوگیا، دروازے کے سامنے سنگِ مرمر کا فرش تھا اس پر سے میرا پاؤں رپٹا اور میں دھم سے گرا، اتنی دیر میں پرنسپل صاحب بھی دروازے تک آگئے تھے، انھوں نے جو مجھے گرتے دیکھا تو دوڑ کر میری طرف بڑھے مجھے اُٹھایا، پوچھتے رہے کہ کہیں چوٹ تو نہیں آئی، ان کی شفقت آمیز باتیں اب تک میرے دل پر "کالنقش فی الحجر" ہیں۔ باتوں ہی باتوں میں پوچھا، میاں صاحبزادے کیا پڑھتے ہو؟ میں نے کہا "معلقات" ان کو بڑا تعجب ہوا، پھر پوچھا، میں نے پھر وہی جواب دیا میری عمر پوچھی، میں نے کہا "مجھے کیا معلوم" وہ میرا ہاتھ پکڑ بجائے اپنے کام کو جانے کے سیدھا مجھ کو مفتی صاحب کے پاس لے گئے اور کہنے لگے "مفتی صاحب یہ لڑکا کہتا ہے کہ میں "معلقات" پڑھتا ہوں، ذرا دیکھئے تو سہی سچ کہتا ہے یا یونہی باتیں بناتا ہے"۔ مفتی صاحب نے کہا "تو کیا پڑھتا ہے؟" میں نے کہا "معلقات"! کہنے لگے "کہاں پڑھتا ہے"؟ میں نے کہا "پنجابیوں کے کٹڑے کی مسجد میں" پھر کہا "معلقات دوں پڑھے گا؟" میں نے کہا "لائیے" انھوں نے میز پر سے کتاب اٹھائی میرے ہاتھ میں اور کہا "یہاں سے پڑھ" جس شعر پر انگلی رکھی تھی وہ یہی شعر تھا ؎

ابا ہند فلا تعجل علینا　　وانظرنا نخبرک الیقینا

میں نے پڑھا معنی بیان کئے، انھوں نے ترکیب پوچھی وہ بیان کی، میاں واقعی تمہاری طرح میں نے شعر نہیں پڑھا تھا اور میاں فرحت تمہاری طرح ترکیب نہیں کی تھی مولوی صاحب کا یہ اشارہ ہماری کمزوریوں کی طرف تھا۔ اس کا ذکر آئندہ آئے گا۔ مفتی صاحب بہت چکرائے پوچھنے لگے "تجھے کون پڑھاتا ہے؟" میں نے کہا "مسجد کے

مولوی صاحب" کہا "مدرسہ میں پڑھے گا" میں نے جواب دیا "ضرور پڑھوں گا" مفتی صاحب نے قلم اٹھا کاغذ پر چند سطریں لکھیں اور پرنسپل صاحب کو دے کر کہا۔ اس کو پریذیڈنٹ صاحب کے پاس پیش کر دیا" ہم وہاں سے نکل اپنے گھر آئے، مولوی صاحب سے کچھ نہ کہا، کوئی سات آٹھ روز کے بعد کالج کا چپراسی مولوی صاحب کے پاس ایک کاغذ لے گیا، اس میں لکھا تھا کہ نذیر احمد کو کالج میں داخل کرنے کی اجازت ہوگئی ہے، کل سے اس کو آپ کالج میں آنے کی ہدایت کر دیجئے، اس کا وظیفہ بھی ہوگیا ہے، چپراسی تو یہ حکم دے چلتا بنا، مولوی صاحب نے مجھ کو بلایا، خط دکھایا، پوچھا یہ کیا معاملہ ہے، میں نے کچھ جواب نہ دیا، جب ذرا سختی کی تو میں نے واقعہ بیان کیا وہ بہت خوش ہوئے اور دوسرے روز لے جا میرا ہاتھ پرنسپل صاحب کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس زمانے میں سید احمد خاں فارسی کی جماعت میں، ملشی ذکاء اللہ حساب کی جماعت میں اور پیارے لال انگریزی کی جماعت میں پڑھتے تھے، میں عربی کی جماعت میں شریک ہوا، ایک تو شوق، دوسرے پڑھانے والے ہوشیار تیسرے ایک مضمون اور وہ بھی ایسا جس کا مجھے بچپن سے شوق تھا، تھوڑے ہی دنوں میں میں نے اپنی سب جماعت والوں کو دبا لیا۔ اب جب کبھی یہ شعر پڑھتا ہوں تو پہلا زمانہ یاد آجاتا ہے اور میں بے اختیار ہنسنے لگتا ہوں۔ یہ کہتے ہی انھوں نے لہک لہک کر یہ شعر ؎

ابا هند فلا تعجل علینا ٭ وانظرنا نخبرک الیقینا

پڑھنا اور ہنسنا شروع کیا۔

میں نے کہا "مولوی صاحب آپ کی جماعت کہاں بیٹھتی تھی" کہنے لگے "پرنسپل صاحب کے کمرے کے بازو میں جو چھوٹا کمرہ ہے اس میں ہماری جماعت تھی، دوسرے

پہلو میں جو کمرہ ہے اس میں فارسی کی جماعت"۔ دانی نے کہا "مولوی صاحب آپ گے اختیاری مضمون کیا تھے"، مولوی صاحب ہنسے اور کہا "میاں دانی! ہم پڑھتے تھے تم آجکل کے طالب علموں کی طرح جوتڑوں سے گھاس نہیں کاٹتے تھے (مولوی صاحب اس فقرہ کا استعمال اکثر کیا کرتے تھے، معلوم نہیں کہاں کا محاورہ ہے) ارے بھئی ایک ہی مضمون کی تکمیل کرنا دشوار ہے آجکل پڑھاتے نہیں لادتے ہیں۔ آج پڑھا کل بھولے، تمہاری تعلیم ایسی دیوار ہے جس میں گارے کا بھی ردّا ہے، ٹھیکریاں بھی گھسیڑ دی گئی ہیں، مٹی بھی ہے پتھر بھی ہے کہیں کہیں چونا اور اینٹ بھی ہے، ایک دھکّا دیا اور اڑا اڑا دھم گری، ہم کو اس زمانے میں ایک مضمون پڑھاتے تھے مگر اس میں کامل کر دیتے تھے، پڑھانے والے بھی ایرے غیرے پچکلیاں نہیں ہوتے تھے، ایسے ایسے کو چھانٹا جاتا تھا جن کے سامنے آجکل کے عالم محض کاٹھ کے الّو ہیں۔ اچھا بھئی اچھا آگے چلو"۔

بانا نورد الرایات بیضا ونصدرھن حمراً قد روینا

میں نے کہا "مولوی صاحب پہلے شعر کے معنی تو رہ ہی گئے"، کہنے لگے "اتنا بڑا قصّہ سنا دیا اس کے بعد بھی اس شعر کے معنوں کی ضرورت ہے، بس اس کے یہی معنی ہیں کہ تحقیق ایک ملّا کا بیٹا، ڈاکٹر، ڈپٹی، شمس العلما، ایل۔ ایل۔ ڈی ہو گیا ساتھ آسانی کے بیچ اسی دِلّی کے، بوجہ اس شعر کے"۔

مولوی صاحب کی تعلیم کا حال سن چکے، اب ہماری تعلیم کا حال سنیئے اور قصّہ کو سراج الدین صاحب کی دوکان کے واقعہ کے دوسرے دن سے لیجیئے۔

میں اور میاں دانی ساڑھے گیارہ بجے مدرسہ سے آئے اور کھانا دانا

کھایا، سبق کا مطالعہ کیا اور ایک بجے نکل کھڑے ہوئے، مکان کا پتہ پوچھتے پوچھاتے ڈیڑھ
بیں پانچ منٹ تھے کہ مولوی صاحب کے دروازے پر جا دھمکے، دروازے کی ایک
پٹو کی پر میں اور دوسری پر میاں دانی ڈٹ گئے۔ سامنے ہی کمرہ تھا بی چاری رسّی ہاتھ
میں لئے اونگھ رہی تھیں، کبھی کبھی رسّی کو ایک آدھ جھٹکا دیدیتی تھیں، کمرے کے اندر
مولوی صاحب تھے لیکن دروازہ بند تھا۔ اس لئے دکھائی نہ دیتے تھے۔ اب یہ خیال
ہوا کہ یہ مولوی صاحب ہی کا مکان ہے یا کسی دوسرے کا؟ اندر زنانہ تو نہیں ہے غرض
اسی شش و پنج میں تھے کہ مولوی صاحب کے کمرے کے گھنٹے نے ٹن سے ڈیڑھ بجایا، ہم
دونوں اُٹھے اور بے پاؤں چوروں کی طرح اندر داخل ہوئے۔ گھر میں سناٹا تھا۔
بی چاری نے سر بھی اٹھا کر نہ دیکھا کہ کون جا رہا تھا، کمرہ کا ایک دروازہ کھلا تھا،
اس میں گردن ڈال کر جھانکا، چونکہ روشنی سے اندھیرے میں آئے تھے اس لئے کچھ دکھائی
نہ دیا۔ اندر سے کسی نے ڈانٹ کر کہا "کون ہے" اس آواز کو پہچان کر ہم تو سنبھل گئے
مگر بی چاری اچھل پڑی اور بے اختیار ان کے منہ سے گنبد کی آواز کی طرح نکلا "کون
ہے" میں نے کہا "میں اور دانی" مولوی صاحب نے کہا "آؤ بیٹیا، اندر آؤ" مولوی
صاحب فوراً پلنگ پر اٹھ بیٹھے اور تہمد سنبھالتے ہوئے نیچے اتر آئے، پوچھا کیا پڑھتے
ہو؟ ہم نے کتاب پیش کی، تھوڑی دیر تک الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے، اس کے بعد
کہا ایک کتاب میرے لئے بھی لیتے آنا۔ ہم نے اپنی ایک کتاب ان کو دیدی اور
دوسری سے مل کر کام نکالا۔ کیا پڑھایا اور کس طرح پڑھایا، اس کا میں آئندہ ذکر
کروں گا، ہاں یہ ضرور ہے کہ جب پڑھ کر اُٹھے تو سب کچھ یاد تھا مگر دماغ پر کسی قسم کا
بار نہ معلوم ہوتا تھا خوشی خوشی گھر آئے چلو "اللہ دے اور بندہ لے۔"

ہم نے بھی کالج میں مولوی صاحب کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے، یہاں تک کہ یہ آواز ہندو کالج کے طلباء کے کان تک پہنچی۔ وہاں کے ایک طالب علم مسٹر رضا کے دل میں گُدگُدی اُٹھی، وہ آئے، ہم سے ملے اور کہا "بھئی میں بھی تمہارے ساتھ چلوں، مولوی صاحب انکار تو نہ کریں گے"، ہم نے کہا "چلو اور ضرور چلو، مولوی صاحب کا کیا بگڑتا ہے، دو کو نہ پڑھایا تین کو پڑھایا" انھوں نے کہا "نہیں پہلے مولوی صاحب سے پوچھ لو" ہم نے کہا "یار چلو بھی، اگر انھوں نے کچھ کہا تو ہمارا ذمہ" وہ راضی نہ ہوئے اور یہی کہ پہلے پوچھ لو، اس عرصہ میں ہماری ہمت مولوی صاحب کے سامنے بہت بڑھ گئی تھی، دوسرے دن جاتے ہی رضا کا ذکر کیا، انھوں نے کہا "لیتے کیوں نہ آئے" ہم نے کہا وہ ذرا شرمیلے ہیں بغیر اجازت آنا نہیں چاہتے" انھوں نے کہا "طالب علم شرمیلا ہوا اور ڈوبا، خیر کل ضرور ساتھ لانا، ذرا ان کا بھی رنگ دیکھ لوں" شام کو واپسی کے وقت جاتے جاتے فراش خانے میں ہم نے رضا کو مولوی صاحب کا اجازت نامہ پہنچا دیا اور کہدیا کہ بھئی پورے ڈیڑھ بجے پہنچ جانا ورنہ اندر گھسنا نہ ملے گا۔ دوسرے دن جو ہم پہنچے تو وہ پہلے ہی سے دروازے پر دھنی دیئے بیٹھے تھے ٹھیک ڈیڑھ بجے ہم اندر داخل ہوئے، مولوی صاحب ہم کو دیکھتے ہی پلنگ پر اُٹھ بیٹھے اور کہا "لاؤ کتاب" ہم نے کتاب طاق پر سے اُتار ان کے ہاتھ میں دے دی اور وہ کتاب لیتے لیتے نیچے آ بیٹھے اور کہا "اچھا یہ ہیں میاں رضا؟" بیچارے رضا نے گردن جھکا کر کہا "جی ہاں" مولوی صاحب نے کہا "اچھا بھئی شروع کرو"

ہمارے پڑھنے کا یہ طریقہ تھا کہ ایک روز میں پڑھتا تھا، دوسرے روز میاں وانی اب اس کو ہماری شرارت کہو یا محض اتفاق ہم دونوں چپکے بیٹھے رہے جب اس خاموشی

نے طول کھینچا تو مولوی صاحب نے کہا "ارے بھئی آج تم پڑھتے کیوں نہیں، کیا منھ میں گنگنیاں بھر کر آئے ہو، اچھا میاں رضا! تم ہی شروع کرو!" رضا نے صفحہ پوچھا اور پڑھنا شروع کیا، مگر اعراب کی غلطیاں مجھ سے کم کیں تو نظم کو نثر میاں دانی سے زیادہ بنا دیا۔ ایک آدھ شعر تک تو مولوی صاحب چپکے سنتے رہے، اس کے بعد کہنے لگے "واہ بھئی واہ ہم کو عجب نمونے کے شاگرد ملے ہیں، میاں رضا اگر ہم تم کو ایک نیک صلاح دیں تو مانو گے" رضا نے نہایت شرمیلی آواز میں گردن جھکا کر کہا "بسر و چشم"، مولوی صاحب نے کہا "دیکھو اپنے وعدے سے پھر نہ جانا"، انھوں نے کہا "جی نہیں"، مولوی صاحب نے کہا "اچھا تو مری یہ صلاح ہے کہ کل سے تم میرے ہاں نہ آنا" یہ سنکر وہ بیچارے کچھ پژمردہ سے ہو گئے مولوی صاحب نے کہا "بھئی رضا یہ میں نہیں کہتا کہ میرے ہاں آنا ہی چھوڑ دو، میں تم کو ضرور پڑھاؤں گا مگر تم دس پندرہ روز شام کے وقت "کالی جان" کے ہاں تعلیم میں ہو آیا کرو، اتنے دنوں کے آنے جانے میں تمہارے کانوں کو نظم و نثر کا فرق معلوم ہونے لگے گا، بھئی مجھ سے تو شعروں کے گلے پر چھری پھرتے دیکھا نہیں جاتا، بے چارے متنبّی کو کیا خبر تھی کہ بتاشوں کی گلی میں نذیر احمد کے کمرے میں ان کے اشعار مولوی رضا صاحب اس طرح حلال کریں گے"۔ بیچارے رضا کے سر پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ خدا خدا کر کے سبق ختم ہوا اور ہم سب رخصت ہوئے۔ راستہ میں ہم نے ان کو بہت بنایا، دوسرے روز سے وہ ایسے غائب ہوئے کہ پھر شکل نہ دکھائی۔

مسٹر رضا کی حیا کا حال تو سن چکے اب ہماری بے حیائی کی داستان بھی سن لیجئے! میری صرف و نحو بہت کمزور تھی اور کمزور کیوں نہ ہوتی، شروع کئے ہوئے کے دن ہوئے تھے، اعراب میں ہمیشہ غلطی کرتا تھا، نثر کو تو سنبھال لیتا تھا مگر نظم میں دقّت پڑتی تھی،

شعر خود بھی کہتا تھا دوسروں کے ہزاروں اشعار یاد تھے۔ اس لئے شعر کو تقطیع سے گرنے نہ دیتا تھا۔ میاں وانی کی حالت اس کے بالکل برعکس تھی، وہ اعراب کی غلطی نہ کرتے تھے مگر شعر کو نثر کر دیتے تھے۔ سکتے تو کیا جھٹکے پڑ جاتے تھے۔ مولوی صاحب ہم دونوں کے پڑھنے سے بہت جُزبُز ہوتے تھے۔ ایک دن یہ ہوا کہ میرے پڑھنے کی باری تھی۔ میں نے ایک شعر پڑھا، معلوم نہیں کہاں کے اعراب کہاں لگا گیا۔ مولوی صاحب نے کہا، "ہیں کیا پڑھا" میں سمجھا کہ اعراب میں کہیں غلطی ضرور ہوئی تمام اعراب بدل کر شعر موزوں کر دیا، انھوں نے، پھر بڑے زور سے "ہوں"، کی ہم نے پھر اعراب بدل دیئے۔ اس سے ان کو غصہ آ گیا کہا "وانی تم پڑھو"، انھوں نے شعر کا گلا ہی گھونٹ دیا۔ خاصے بھلے چنگے شعر کو نثر بنا دیا۔

اب کیا تھا، مولوی صاحب کا پارہ ایک سو دس ڈگری پر چڑھ گیا کتاب اٹھا کر جو پھینکی تو کمرہ سے گذر دالان میں ہوتی ہوئی صحن میں پہنچی اور نہایت غصیلی آواز میں کہا "نکل جاؤ، ابھی میرے گھر سے نکل جاؤ، نہ تم مجھ سے پڑھنے کے قابل ہو اور نہ میں تمہارے پڑھانے کے لائق" وانی نے میری طرف دیکھا، میں نے وانی کی طرف دیکھا۔ انھوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا "چلو"، میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب دیا "ہرگز نہیں"، انھوں نے اُٹھنے کا ارادہ کیا، میں نے ان کا زانو دبا دیا۔ مولوی صاحب کی یہ حالت تھی کہ شیر کی طرح بپھر رہے تھے، آخر جب دیکھا کہ یہ لونڈے ٹس سے مس نہیں ہوتے تو کہنے لگے اب جاتے ہو یا نہیں، میں نے کہا "مولوی صاحب جب تک کوئی دھکّے دیکر نہ نکالے گا اس وقت تک تو ہم جاتے نہیں اور جائیں گے تو پھر ابھی آ جائیں گے"۔ مولوی صاحب نے جو یہ بے حیائی دیکھی تو ذرا نرم ہوئے۔ کہنے لگے "اچھا نہیں جاتے ہو نہ جاؤ، مگر میں تم کو ایک حرف نہ پڑھاؤں گا"۔ میں نے کہا "نہ پڑھائیے مگر بغیر پڑھے ہم یہاں سے نہ ہلے ہیں نہ ہلیں گے"۔

کہنے لگے "بیٹا اس وقت میری طبیعت خراب ہو گئی ہے، اب چلے جاؤ کل آجانا۔" دانی نے
سچ جانا، میں سمجھا کہ اس وقت اٹھے تو مولوی صاحب ہاتھ سے گئے۔ دانی اٹھ کھڑے ہوئے۔
میں نے پکڑ کر ان کو بٹھا لیا مولوی صاحب یہ تماشا دیکھتے رہے، میں نے کہا "مولوی صاحب
پڑھیں گے تو اس وقت پڑھیں گے، پڑھانا ہے تو پڑھائیے ورنہ ہم کو یہاں سے جانا ہے
نہ جائیں گے"، آخر کار ہم جیتے اور مولوی صاحب ہارے، کہنے لگے "خدا محفوظ رکھے تم جیسے
شاگرد بھی کسی کے نہ ہوں گے شاگرد کیا ہوئے استاد کے استاد ہو گئے، اچھا بھئی میں ہارا
اچھا خدا کے لئے کتاب اٹھا لاؤ اور سبق پڑھ کر میرا پنڈ چھوڑو، دیکھئے کون سا دن ہوتا ہے
کہ میرا تم سے چھٹکارا ہوتا ہے"، میں جا کر صحن میں سے کتاب اٹھا لایا اور مولوی صاحب
جیسے تھے ویسے کے ہو گئے، کہا کرتے تھے "اگر اس روز تم چلے جاتے تو میرے گھر میں گھسنا
نصیب نہ ہوتا۔ میں تمہارے شوق کو آزماتا تھا مگر تم نے مجھے ہی آزما ڈالا، خدا ایسے شاگرد
سب کو نصیب کرے، یہ بے حیائی نہیں میاں یہ شوق ہے۔ علم کا جس کو چسکا ہوتا ہے
وہ بری بھلی سب ہی کچھ سنتا ہے۔ بدشوق بھاگ نکلتے ہیں اور شوقین استاد کو دبا لیتے ہیں"۔

پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ ہم میں سے کسی نے کتاب میں سے ایک شعر پڑھا اور مولوی
صاحب نے کتاب الٹ کر میز پر رکھ دی۔ پہلے دانی کی طرف متوجہ ہوئے اور صرف و نحو کے نکات
پر بحث شروع ہوئی۔ اس بحث میں مجھے "بارہ پتھر باہر" سمجھ لیا جاتا تھا کبھی میں نے دخل بھی
دیا تو مولوی صاحب نے فرمایا "آپ مہربانی کر کے اس بارے میں اپنے دماغ پر زور ڈالنے
کی تکلیف گوارا نہ فرمایئے" اس کے بعد معنی بیان کئے، نکات بتائے اور پھر اسی مضمون کے اشعار
اور مقولوں کا سلسلہ چھڑا، اب میاں دانی خارج از بحث ہو گئے۔ اول تو مجھے یونہی
ہزاروں اشعار یاد تھے، دوسرے خاص طور پر تیار ہو کر جاتا تھا۔ مولوی صاحب اگر ایک

شعر پڑھتے تو میں دو پڑھنے کو تیار ہو جاتا، غرض جب فریقین اپنا ہندوستانی گولہ بارود ختم کر چکتے تو یورپ اور انگلستان کے شعرا اور فلسفیوں کے مقولوں کا نمبر آتا، اس میں دادی بھی شریک ہو جاتے اگر کوئی شعر قصّہ طلب ہوا اور اسی قسم کا کوئی ماجرا مولوی صاحب پر گذرا ہوتا تو اس قصّہ کے ساتھ اپنا قصّہ بھی ضرور بیان کر دیتے۔ غرض ایک شعر کی تصریح میں آدھ آدھ گھنٹہ گذر جاتا مگر اس کے بعد جو شعر ذہن نشین ہوتا تو اس کا محو ہونا مشکل تھا چنانچہ اب تک مجھے اکثر شعر یاد ہیں۔ اگر کوئی رزمیہ قصیدہ ہوا تو اس سلسلہ میں اکثر غدر کے حالات بیان کرتے اور جو کچھ شرفائے دہلی پر اس طوفانِ بدتمیزی میں گذری تھی اسکی داستان نہایت دردناک الفاظ میں سناتے اکثر کہا کرتے تھے "میاں بے چارا بہادر شاہ مجبور تھا، کسی اور پر بھی اگر یہی مصیبت نازل ہوتی تو وہ بھی اسی طرح ان بدمعاش تلنگوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح ناچتا، یہ لوگ کوئی بادشاہ کو فائدہ پہنچانے تھوڑے آئے تھے، ان کا مقصد تو شہر کو لوٹنا تھا وہ پورا ہوا اور انھوں نے دہلی کو کھک کر دیا۔" "ایک روز میں دریبہ میں جا رہا تھا، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک فوج کی فوج تلنگوں کی آرہی ہے، میں بھی دب کر گلاب گندھی کی دوکان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ آگے آگے بینڈ والے تھے مگر وہ ایسا اندھا دھند ڈھول ٹھونک رہے تھے کہ خدا کی پناہ، پیچھے کوئی پچاس ساٹھ سوار تھے، مگر ان کی عجیب کیفیت تھی، گھوڑے کیا تھے دھوبی کے گدھے معلوم ہوتے تھے، بیچ میں سوار تھے، مگر گٹھریوں کی کثرت سے جسم کا کچھ تھوڑا ہی سا حصہ دکھائی دیتا تھا یہ گٹھریاں کیا تھیں، دہلی کی لوٹ، جس بھلے آدمی کو کھاتا پیتا دیکھا، اس کے کپڑے تک اتروا لیئے، جس روپیہ پیسے والے کو دیکھا، اس کے گھر پر جا کر دھنی دیدی اور کہا چل ہمارے ساتھ قلعہ کو تو انگریزوں سے ملا ہوا ہے، جب تک کچھ رکھوا نہ لیا اس کا پنڈ نہ

جھوڑا، اگر دہلی کے چاروں طرف انگریزی فوج کا محاصرہ نہ ہوتا تو شریف لوگ کبھی کے دہلی
سے نکل گئے ہوتے، غرض خدائی فوجداروں کا یہ لشکر غل مچاتا، دین دین کے نعرے لگاتا،
میرے سامنے سے گذرا۔ اس جمِ غفیر کے بیچوں بیچ دولہا میاں تھے، یہ کون تھے، عالی جناب
بہادر خاں صاحب سپہ سالار، لباس سے بجائے سپہ سالار کے دولہا معلوم ہوتے تھے۔
جڑاؤ زیوروں میں لدے ہوئے تھے، پہنتے وقت شاید یہ بھی معلوم کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی
گئی تھی کہ کون سا مردانہ زیور ہے اور کون سا زنانہ، صافے پر بجائے طرّے کے سراسری
لگائی تھی۔ جیسے خود زیور سے آراستہ تھے اسی طرح ان کا گھوڑا بھی زیوروں میں لدا ہوا تھا۔
ماش کے آٹے کی طرح اینٹھے جاتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ نعوذ باللہ خدا کی خدائی اب ان
ہی کے ہاتھ آ گئی ہے۔ گلاب گندھی نے جو ان لٹیروں کو آتے دیکھا چپکے سے دوکان بند کر دی
اور اندر دروازوں سے بیٹھا جھانکتا رہا۔ خدا معلوم کیا اتفاق ہوا کہ بہادر خاں کا گھوڑا
عین اسی کی دوکان کے سامنے آ کر رکا، بہادر خان نے اِدھر اُدھر گردن پھیری، پوچھا "یہ
کس کی دوکان ہے" ان کے ایڈی کانگ نے عرض کی کہ "گلاب گندھی کی" فرمایا" اس
بدمعاش کو خبر نہیں تھی کہ مابدولت ادھر سے گذر رہے ہیں، دوکان بند کرنے کے کیا معنی،
ابھی کھلواؤ"، خبر نہیں کہ اس حکمِ قضا شیم کا بے چارے لالہ جی پر اندر کیا اثر ہوا، ہم
نے تو یہ دیکھا کہ ایک سپاہی نے تلوار کا دستہ کواڑ پر مار کر کہا کہ "دروازہ کھولو" اور جس طرح
"سم سم کھل جا" کے الفاظ سے علی بابا کے قصے میں چوروں کے خزانے کا دروازہ کھلتا تھا
اُسی طرح اس حکم سے گلاب کی دوکان کھل گئی، بجنسہٖ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تماشے کا پردہ
اٹھ گیا [illegible] ہاتھ جوڑے کھڑے تھے، کچھ بولنا چاہتے
تھے مگر زبان یاری نہ دیتی تھی، اس وقت بہادر خاں کچھ خوش خوش تھے کسی موٹی اسامی

کو مار کر آئے تھے۔ کہنے لگے "تمہاری ہی دوکان سے بادشاہ کے ہاں عطر جاتا ہے"؟ لالہ جی نے بڑے زور سے گردن کو ٹوٹی ہوئی گڑیا کی طرح جھٹکا دیا۔ حکم ہوا کہ جو عطر بہتر سے بہتر ہو وہ حاضر کرو، وہ لڑکھڑاتے ہوئے اندر گئے اور دو کنٹر عطر سے بھرے ہوئے حاضر کئے۔ معلوم نہیں بیس روپے تولہ کا عطر تھا یا تیس روپے کا، بہادر خاں نے دونوں کنٹر لئے کاگ نکالنے کی تکلیف کون گوارا کرتا ایک کی گردن دوسرے سے ٹکرادی۔ دونوں گردنیں کھٹ سے ٹوٹ گئیں، عطر سونگھا، کچھ پسند آیا ایک کنٹر گھوڑے کی ایال پر الٹ دیا اور دوسرا دم پر، کنٹر پھینک کر حکم دیا گیا "فارورڈ"، اس طرح بچارے گلاب گندھی کا سینکڑوں روپے کا نقصان کر کے یہ ہندوستان کو آزادی دلانے والے چل دیئے، اِدھر اس خدائی فوجدار کا جانا اور اُدھر ہم لونڈوں کا تالیاں بجانا بچارے لالہ جی نے کھسیانے ہو کر دوکان بند کر دی۔ بھئی غدر کے طوفان بے تمیزی میں نقصان جو ہونا تھا وہ ہوا مگر کالج کی دوربین توڑ کر جو نقصان اس بے سری فوج نے ملک کو پہنچایا اس کی تلافی ناممکن ہے۔ کالج میں پرنسپل صاحب کے کمرے کے اوپر ایک بڑی زبردست دوربین نصب تھی پرنسپل صاحب کہا کرتے تھے کہ یہ دوربین کالج کے ایک بڑے دلدادہ انگریز نے کالج کی نذر کی تھی۔ اس کا سامنے کا شیشہ بڑی دِقّت سے تیار ہوا تھا۔ اس انگریز کے خاندان والوں نے برسوں میں اسے گھس کر بنایا اور اتنا پتلا کیا تھا کہ کاغذ سے بھی باریک ہو گیا تھا غرض یہ کہ دوربین کالج کا سرمایۂ ناز تھی، دور سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوٹھے پر ایک بڑی توپ لگی ہوئی ہے۔ غدر کے زمانے میں کسی بدمعاش کی اس پر بھی نظر پڑ گئی اس نے جا کر فوج میں اڑا دیا کہ انگریزوں نے راتوں رات کشمیری دروازہ سے آ کر کالج کے اوپر توپ لگا دی ہے اور اب تھوڑی دیر میں قلعہ اڑا دیں گے، یہ سننا تھا کہ ساری فوج

کالج پر چڑھ آئی، سیڑھیاں لگا کر سینکڑوں سپاہی چھت پر پہنچ گئے، ایک کندۂ ناتراش نے بندوق کا کندہ سامنے کے شیشہ پر مارا، چھن سے شیشے کے ٹکڑے ٹکرے ہو گئے اور ایک خاندان کی پچاس ساٹھ برس کی محنت خاک میں مل گئی، ان نابکاروں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، دوربین کی دوربین اٹھا نیچے پھینک دی اور چند ہی منٹ کے اندر دین دین کے نعروں میں اس یادگار سلف کا ان ناخلفوں کے ہاتھوں خاتمہ بالخیر ہو گیا۔"

غدر کے ہزاروں واقعات مولوی صاحب سے سُنے ہیں لیکن اکثر تو ایسے ہیں کہ ان کا موجودہ زمانے میں دُہرانا خطرناک ہے اور بعض ایسے ہیں کہ وہ پوری طرح یاد نہیں رہے ہم بی اے میں پڑھتے تھے کہ کیمبرج سے غدر کے متعلق ایک لاجواب مضمون پر انعام مقرر ہوا۔ اس مضمون کے لئے شرط یہ قائم کی گئی تھی کہ کوئی واقعہ تاریخی کتاب سے نہ لیا جائے جو کچھ لکھا جائے شہر کے بڈھے بڑھیوں سے دریافت کر کے لکھا جائے۔ میں نے بھی مضمون لکھا تھا اور مجھ ہی کو یہ انعام ملا۔ میں نے اس مضمون میں ایک باب مولوی صاحب کے بیان کردہ قصّوں کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ میں کرید کرید کر مولوی صاحب سے اس مضمون کے لئے واقعات دریافت کیا کرتا اور وہ خوشی خوشی بتاتے اب وہ مضمون دریا بُرد نہیں تو دریا پار ضرور ہو گیا۔ مسودہ نہ رکھا اور نہ رکھنے کی عادت ہے اس لئے اب اس کا ذکر کرنا ہی فضول ہے۔

ہمارے پڑھنے کا طریقہ تو سُن چکے، اب مولویوں کی جماعت کا حال بھی سن لیجئے اس جماعت میں تمام کے تمام سرحد پار کے ہی لوگ تھے، لمبے لمبے کرتے، بڑی بڑی آستینیں ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو تھان کی شلواریں، عمامہ بمقدار علم کے لحاظ سے کئی کئی سیر کے پگڑ، لمبی لمبی ڈاڑھیاں، غرض معلوم ہوتا تھا کہ افغانستان کا کوئی قطعہ اٹھا کر تماشوں کی گلی میں رکھ دیا

گیا ہے۔ محنت کی یہ حالت کہ رات رات بھر کتاب دیکھتے، ٹھوٹھ ایسے کہ باوجود اس محنت
کے کورے کے کورے رہتے، مولوی صاحب ہم سے ہمیشہ ان کی موٹی عقل کی تعریف کیا کرتے اور
کہتے "بھئی میں ان ملاّؤں سے عاجز آگیا ہوں، اپنا بھی وقت ضائع کرتے ہیں اور میرا بھی۔
جواب اس لئے نہیں دے دیتا کہ دل شکنی ہوگی۔ مگر کیا کروں اللہ میاں نے ان لوگوں کو ادب
سمجھنے کا دماغ ہی نہیں دیا ہے۔ ہزار سمجھاتا ہوں ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ بھلا ان کو
"حماسہ" یا "متبنی" پڑھنے کی کیا ضرورت پڑی ہے، فوج میں نوکر ہو جائیں، محنت مزدوری کریں یا
ہینگ کا توبڑا گلے میں ڈال کر بیچتے پھریں!" ہم کہتے "مولوی صاحب آپ بھی غضب کرتے
ہیں، رگڑ سے پتھر بھی گھس جاتا ہے۔ آخر متبنی نے ایسے کون سے شعر کہے ہیں کہ جو غور کرنے
سے سمجھ میں نہ آئیں" ایک روز فرمانے لگے "لو آج تم ٹھہر جاؤ اور ان مولویوں کا رنگ بھی
دیکھ لو، مگر دیکھو کہیں ہنس نہ دینا ورنہ چھری بھونک دیں گے"، اس روز ہم کو بھی چھٹی تھی،
ہم پڑھ کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ یہ جماعت آگئی یہ لوگ مولوی صاحب کو گھیر کر بیٹھ گئے اور
ہم اٹھ کر ایک کونے میں جا بیٹھے۔ اس روز مقامات حریری کا سبق تھا، کتابیں کھولی گئیں
اور ایک صاحب نے بڑی گرجتی ہوئی آواز میں آعوذ باللہ سے سبق شروع کیا۔ زید بن
حارث کے سفر کا حال تھا اور رات کے وقت سفر کرنے کو "فی اناءِ اللیل" سے ادا کیا تھا،
ان بھلے آدمیوں نے رات کو قاموس دیکھ کر مطالعہ کیا تھا اس میں شامتِ اعمال سے
"اناء" کے معنی مٹکے کے بھی ہیں "اللہ دے اور بندہ لے" انھوں نے یہاں مٹکا پھنسا دیا
اور نہایت متانت سے "فی اناءِ اللیل" کے معنی "رات کے مٹکے میں سفر کیا" سے کر دیئے،
مولوی صاحب نے فرمایا "اناء" کے دوسرے معنی کچھ تو ہیں پڑھنے والے نے کہا جی ہاں
کئی معنی ہیں لیکن اس مقام پہ مٹکا ہی زیادہ چسپاں ہوتا ہے"، ہم کو ہنسی آئی، مولوی صاحب

نے مسکرا کر اور ان لوگوں نے نہایت بڑے بڑے دیدوں سے ہماری طرف دیکھا، ہم نے سوچا
بھائی یہاں ہمارا ٹھکانا نہیں، یہاں سے کھسک ہی جانا مناسب ہے کہیں کوئی اٹھ کر
گلا نہ گھونٹ دے، ہم نے اجازت چاہی مولوی صاحب کہتے ہی رہے "بیٹھو ذرا اور
کچھ سن جاؤ"، ہم نے کہا "مولوی صاحب ہم کو کام ہے کسی اور دن دیکھا جائے گا"، یہ
کہہ جوتیاں پہن سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے، کوٹھے سے اتر جو ہنسنا شروع کیا تو گھر پہنچتے
پہنچتے بڑی مشکل سے ہنسی رکی۔ اب جب کبھی خیال آتا ہے تو اس جماعت کا نقشہ آنکھوں
کے نیچے پھر جاتا ہے اور رات کے مٹکے میں سفر کرنے کا فقرہ ہنساتا نہیں تو مسکراہٹ
ضرور پیدا کر دیتا ہے۔

مولوی صاحب کو اپنے ترجمہ پر ناز تھا اور اکثر اس کا ذکر فخریہ لہجے میں کیا کرتے
تھے۔ اردو ادب میں ان کی جن تصنیفات نے دھوم مچادی ہے وہ ان کے نزدیک بہت
معمولی چیزیں تھیں، وہ کہا کرتے تھے کہ میری تمام عمر کا اصلی سرمایہ کلام مجید کا ترجمہ ہے۔ اس
میں مجھے جتنی محنت اٹھانی پڑی ہے اس کا اندازہ کچھ میں ہی کر سکتا ہوں۔ ایک ایک لفظ
کے ترجمہ میں میرا سارا سارا دن صرف ہو گیا ہے" میاں سچ کہنا کیسا محاورہ کی جگہ محاورہ
بٹھایا ہے، ہم نے کہا "مولوی صاحب بٹھایا نہیں ٹھونسا ہے"۔ جہاں یہ فقرہ کہا اور مولوی
صاحب اچھل پڑے، بڑے خفا ہوتے اور کہتے "کل کے لونڈو میرے محاوروں کو غلط بتاتے ہو، میاں
میری اردو کا سکہ تمام ہندوستان پر بیٹھا ہوا ہے، خود لکھو گے تو چیں بول جاؤ گے"۔ محاوروں
کی بھرمار کے متعلق اکثر مجھ سے ان کا جھگڑا ہوا کرتا تھا، میں ہمیشہ کہا کرتا تھا، مولوی صاحب
آپ نے محاوروں کی فہرست تیار کر لی ہے اور کسی نہ کسی محاورہ کو آپ کسی نہ کسی جگہ پھنسا دینا چاہتے
ہیں، خواہ اس کی گنجائش وہاں ہو یا نہ ہو، جناب والا اہل زبان کو یہ دکھانے کی ضرورت

نہیں کہ وہ محاوروں پر حاوی ہے، یہ صرف وہ لوگ کرتے ہیں جو دوسروں کو بتانا چاہتے ہیں کہ ہم باہر والے نہیں دہلی والے ہیں" تھوڑی دیر تو حجت کرتے، اس کے بعد کہتے "اچھا بھئی تم ہی دہلی والے سہی، ہم تو اسی طرح لکھیں گے جس طرح اب تک لکھا ہے، تم ہم کو دہلی والوں کی فہرست سے نکال دو، مگر میاں اپنا ہی نقصان کروگے"۔

مجھ کو مولوی صاحب کی طرز تحریر پر کوئی رائے ظاہر کرنے کا حق نہیں ہے کیونکہ اوّل تو میرے لئے ابتدا ہی میں "خطائے بزرگاں گرفتن خطا است" کی سب سے بڑی ٹھوکر ہے، دوسرے میری قابلیت محدود کی سرحد سے گذر کر مفقود کی سرحد میں آگئی ہے لیکن باوجود ان موانعات کے میں نے مولوی صاحب کے سامنے بھی کہا، اب بھی کہتا ہوں اور ہمیشہ کہوں گا کہ محاوروں کے استعمال کا شوق مولوی صاحب کو حد سے زیادہ تھا، تحریر میں ہو یا تقریر میں وہ محاروں کی ٹھونسم ٹھانس سے عبارت کو بے لطف کر دیتے تھے اور بعض وقت ایسے محاورے استعمال کر جاتے تھے جو بے موقع ہی نہیں اکثر غلط ہوتے تھے۔ خدا معلوم انھوں نے محاوروں کی کوئی فرہنگ تیار کر رکھی تھی یا کیا کہ ایسے ایسے محاورے ان کی زبان اور قلم سے نکل جاتے تھے جو نہ کبھی دیکھے نہ سُنے، ان کی عبارت کی روانی اور بے ساختگی کا جواب دوسری جگہ ملنا مشکل ہے مگر چلتے چلتے راستہ میں عربی الفاظ کے روڑے ہی نہیں بچھاتے تھے بلکہ پہاڑ رکھ دیتے تھے، غرض یہ تھی کہ لوگ یہ جان لیں کہ میں دہلی والا ہی نہیں مولوی بھی ہوں، بہر حال ان کی تحریر کا ایک رنگ ہے اور اس کی نقل اتارنا مشکل اور بہت مشکل ہے ترجمہ کرنے کا انھیں خاص ملکہ تھا، وجہ یہ تھی کہ کئی زبانوں پر حاوی تھے اگر ایک زبان کے لفظ سے مطلب ادا نہ ہوا تو دوسری زبان کا لفظ وہاں رکھ دیا۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔

۱۹۰۳ء کے دربار تاجپوشی پر جو انگریزی کتاب لکھی گئی تھی اس کا ترجمہ مولوی صاحب کے سپرد ہوا، ایک روز جو ہم پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ خوبصورت سی جلد کی ایک بڑی موٹی کتاب مولوی صاحب کی میز پر رکھی ہے۔ ہم نے اجازت لے کر کتاب اٹھائی اور اوّل سے آخر تک ساری تصویریں دیکھ ڈالیں، اول تو مولوی صاحب بیٹھے دیکھتے رہے، پھر کہنے لگے "بٹیا! یوں سرسری نظر سے کیا دیکھتے ہو گھر لے جاؤ، اچھی طرح پڑھو، مگر دیکھو خراب نہ کرنا" ہم دونوں نے دل میں سوچا کہ خدا معلوم کیا بھید ہے جو مولوی صاحب بغیر مانگے اپنی کتاب دے رہے ہیں. خوش خوش کتاب بغل میں مار گھر آئے، دو ایک روز میں پڑھ ڈالا، ایک آدھ تصویر بھی غائب کردی، چوتھے روز کتاب لے جا مولوی صاحب کے حوالہ کی۔ پوچھا "کہو پسند آئی"، ہم نے کہا "مولوی صاحب خوب کتاب ہے"۔ کہنے لگے "اچھی کتاب ہے تو ترجمہ کر ڈالو" ہم نے کورا جواب دے دیا، کہا "دیکھو، سنو اس کتاب کا مجھے ترجمہ کرنا ہے، تم سے ترجمہ کراؤں گا، صحیح میں کروں گا اب مجھ میں اتنا دم نہیں کہ اتنی بڑی کتاب کا ترجمہ کر سکوں، اگر اب کے انکار کیا تو کل سے گھر میں گھسنے نہ دوں گا، یہ کہتے کہتے کتاب کی جلد توڑ دس صفحہ میرے اور دس میاں دانی کے حوالہ کر دیئے۔ ساتھ ہی میاں رحیم بخش کو آواز دی اور وہ آئے ان کو حکم دیا کہ "ایک ایک دستہ بادامی کاغذ کا ان دونوں کو دیدو"۔ "قہر درویش بر جان درویش" کی صورت تھی جس طرح پہلے خوشی خوشی پوری کتاب لے گئے تھے اسی طرح منہ بنائے ہوئے ان پلندوں کو بغل میں مارا گھر آکر بیگار کے کام کی طرح ترجمہ کیا، دوسرے روز جاکر پڑھنے کے لئے کتاب اُٹھائی، پوچھا "ترجمہ لائے"، ہم نے دبی ہوئی آواز میں کہا "لائے"۔ کہا "پہلے وہ پڑھو"، ہم پڑھتے جاتے اور مولوی صاحب اصل کتاب دیکھ کر اس کی درستی کرتے جاتے، اب اگر ہم یا میاں دانی کہیں کہ یہ ترجمہ ہمارا ہے تو یقین مانیئے کہ دونوں

جھوٹے ہیں۔ مولوی صاحب کی اصلاح نے ہماری آنکھیں کھول دیں اور ہم نے سمجھ لیا کہ اس علم میں بھی مولوی صاحب سے بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے اس کے بعد سے ہمیں ترجمہ کا شوق ہو گیا اور تھوڑے ہی دنوں میں کتاب ختم ہو گئی۔ اس کے چھپنے کے بعد ہماری مولوی صاحب سے بڑی جنگ ہوئی کیونکہ بندۂ خدا نے ہم دونوں غریبوں کا اس میں ذرا بھی ذکر نہیں کیا، مگر کچھ پروا نہیں اس کا بدلہ اب ہم لئے لیتے ہیں اور ڈنکے کی چوٹ کہے دیتے ہیں کہ اس کتاب میں تھوڑے بہت لفظ ہم دونوں کے بھی ہیں، یہ ضرور ہے کہ اگر اصلاح شدہ مسودوں کو دیکھا جائے تو کاٹ چھانٹ کی وجہ سے ہمارے لفظوں کا تلاش کرنا سر میں لیکھیں دیکھنے سے کم مشکل نہ ہوگا۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ مولوی صاحب چونکہ کئی زبانوں پر حاوی تھے اس لئے اُن کو کہیں نہ کہیں سے مناسب لفظ ادائے مطلب کیلئے ضرور مل جاتا تھا مثلاً اسی جنٹن نا جیوشی کی کتاب میں ایک جگہ لفظ STALLION آیا۔ ڈکشنری میں جو دیکھا تو اس کے معنی "سیاہ بڑا جنگی گھوڑا" نکلے، یاروں نے ترجمہ میں وہی الفاظ ٹھونک دیئے، جب مولوی صاحب نے یہ الفاظ سُنے تو بہت ہنسے، کہنے لگے "واہ بٹیا واہ کیوں نہ ہو، دہلی والے ہو، خالص اردو لکھی ہے، بندۂ خدا، "شبدیز" لکھ دو، چلو چھٹی ہوئی"۔ کوئی صاحب اس سے بہتر لفظ بتا دیں تو میں جانوں۔ ان کے ترجمہ میں خوبی یہ ہوتی تھی کہ لفظ کی جگہ لفظ بٹھاتے تھے، لیکن وہ لفظ ایسا ہوتا تھا کہ وہاں نگینہ بن جاتا تھا۔ تعزیرات ہند کا ترجمہ اٹھا کر دیکھو وہی لفظ پر لفظ، معنی بھی پورے دیتا ہے اور اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا، سینکڑوں کتابوں کے ترجمے ہوئے، دوسری اشاعت میں کچھ اور تیسری میں کچھ کے کچھ ہو گئے لیکن تعزیرات ہند کا ترجمہ جوں کا توں ہے، ایک لفظ اِدھر سے اُدھر نہیں ہوا، کہا کرتے تھے کہ تعزیرات ہند کا ترجمہ بھی میرا ایک کارنامہ ہے، اس کتاب کے ترجمہ

کا کام تین آدمیوں کے سپرد ہوا تھا، ان میں ایک مولوی عظمت اللہ صاحبؒ اس کی اصلاح ڈائرکٹر صاحب کے ذمہ تھی اور ہم ڈائرکٹر صاحب کے سررشتہ دار تھے' روزانہ ایک دو دفعات کا ترجمہ آتا، ہم ڈائرکٹر صاحب کو سناتے، وہ بڑا غل مچاتے کہ "یہ لفظ خلاف محاورہ ہے، اس لفظ سے مفہوم ادا نہیں ہوتا، یہ لفظ اپنی طرف سے بڑھا دیا گیا ہے" غرض دو تین دفعات کہیں تین چار گھنٹے میں پاس ہوتیں، مجھے بڑا تاؤ آتا تھا کہ ترجمہ کرے کوئی یہ باتیں سنے کوئی، مگر بھئی یہ ضرور کہوں گا کہ وہ بھلا آدمی جو بات کہتا تھا "باون تولے پاؤ رتی" کی کہتا تھا، جو اعتراض کرتا تھا وہ اٹھائے نہ اٹھتا تھا۔ میاں پرانے زمانے کے انگریز غضب کی اردو سمجھتے تھے گو اچھی اردو لکھ نہ سکیں، مگر ترجمہ کی وہ غلطیاں نکالتے تھے کہ تم جیسے دہلی والوں کے کان پکڑوا دیں۔ میں نے بھی ترجمہ دیکھا تو واقعی کچھ اکھڑا اکھڑ معلوم ہوتا۔ میں نے کہا کہ نذیر احمد تو بھی خم ٹھونک کر میدان میں کیوں نہیں آ جاتا، اردو جانتا ہے، فارسی جانتا ہے، عربی جانتا ہے، کچھ ٹوٹی پھوٹی انگریزی بھی سمجھتا ہے۔ ان لوگوں سے اچھا نہیں تو کم سے کم ایسا ترجمہ تو بھی کر لے گا۔ یہ سوچ سوا روپیہ کی رائل ڈکشنری بازار سے خرید لایا، رات کو لیمپ جلا، کپڑے اتار، لنگوٹ باندھ ترجمہ پر پل پڑا، جن دفعات کا ترجمہ دوسرے روز پیش ہونے والا تھا ان کا ترجمہ خود کر ڈالا۔ دوسرے دن ترجمہ جیب میں ڈال دفتر پہنچا، ڈائرکٹر صاحب آئے مجھے بلایا ان لوگوں کے ترجمہ کو سن کر وہی گڑ بڑ شروع کی، خدا خدا کر کے یہ مشکل آسان ہوئی۔ میں نے کہا کہ "کمترین بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔" کہا "اچھا کہو"۔ میں نے جیب میں سے کاغذ نکالا وہ سمجھے عرضی ہے۔ لینے کو ہاتھ بڑھایا میں نے کہا "عرضی نہیں ہے، آج کی دفعات کا ترجمہ میں نے بھی کیا ہے۔" ڈائرکٹر صاحب یہ سن کر اچھل پڑے، کہنے لگے، تم

نے، تم نے ترجمہ کیا ہے، تم کو تو انگریزی نہیں آتی پھر ترجمہ کیسے کیا؟ میں نے کہا۔ رائل ڈکشنری سے، انھوں نے ہنس کر کہا "تعزیراتِ ہند کا ترجمہ رائل ڈکشنری سے نہیں ہوا کرتا"، میں نے کہا "سن تو لیجئے"، کہا "اچھا سناؤ"، میں نے جو پڑھا تو صاحب بہادر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، کہنے لگے "یہ ترجمہ تم نے رائل ڈکشنری سے کیا ہے؟" میں نے کہا "ہاں" کہنے لگے "کل شروع کی چار دفعات کا ترجمہ کر کے لاؤ"، میں دوسرے دن لے کر گیا، بہت پسند کیا اور کہا "تم نے پہلے ہی کیوں نہ کہا کہ میں ترجمہ کر سکتا ہوں جو میرا اتنا وقت ضائع کرایا، جاؤ تم بھی ان ترجمہ کرنے والوں میں شریک ہو جاؤ"، اس دن سے ہم بھی پانچوں سواروں میں مل گئے اور یہی ہماری ترقی کا زینہ تھا۔ اب رہے ہماری تصنیفات پر انعام، وہ تو اللہ میاں نے چھپر پھاڑ کر دیئے ہیں۔ اگر کوئی کہتا بھی کہ "مراۃ العروس" پر تم کو انعام ملے گا تو میں اس کو دیوانہ سمجھتا، اصل یہ ہے کہ میں نے یہ کتاب اپنی لڑکی کے لئے لکھی تھی وہی پڑھا کرتی تھی، میاں بشیر کو "چند پند" لکھ دی تھی۔ میں اس زمانہ میں تعلیمات کا انسپکٹر تھا، دورے پر نکلا تھا، بال بچے ساتھ تھے، ایک جگہ ٹھہرے تھے کہ مسٹر کیمپ سن ڈائرکٹر تعلیمات کا ڈیرہ بھی قریب میں آ لگا۔ شام کا وقت تھا، میاں بشیر اپنی ٹٹوانی پر سوار ہو کر ہوا خوری کو نکلے، اُدھر ڈائرکٹر صاحب آ رہے تھے میاں بشیر نے جھک کر سلام کیا، صاحب ٹھہر گئے، پوچھا "میاں تمہارا کیا نام ہے؟" انھوں نے نام بتایا، پھر پوچھا "تمہارے والد کون ہیں؟" انھوں نے میرا نام بتایا۔ پھر پوچھا "کہو میاں کیا پڑھتے ہو"، انھوں نے کہا "چند پند" ڈائرکٹر صاحب سمجھتے تھے کہ اردو کی پہلی یا دوسری کہے گا "چند پند" کا نام سن کر پریشان ہوئے کیونکہ اس عجیب و غریب نام سے ان کے کان نا آشنا تھے، کہا، ہمیں اپنی کتاب

دکھاؤ گے" بشیر نے کہا "جی ہاں ابھی لاتا ہوں، ہماری آپا کی بھی کتاب دیکھئے گا" انھوں نے کہا "اس کتاب کا کیا نام ہے"، انھوں نے کہا "مراۃ العروس" یہ دوسرا نیا نام تھا، صاحب نے کہا "ہاں وہ بھی لاؤ" میاں بشیر ٹٹوانی سے کود بھاگتے ہوئے ڈیرے میں آئے اور اپنا جزدان کھول "چند پند" نکالی، اس کے بعد اپنی بہن کے جزدان پر قبضہ کیا، اس نے جو دیکھا کہ بشیر جزدان ٹٹول رہا ہے تو دوڑتی ہوئی گئی، اتنے میں بشیر "مراۃ العروس" لے کر بھاگا یہ اس کے پیچھے بھاگی، دونوں میں بڑی دھینگا مشتی ہوئی، خوب رونا پیٹنا ہوا، بشیر بہن کو دھکّا دے، کتاب لے، یہ جا وہ جا بہن صاحبہ نے دل کا بخار آنسو بہا کر نکالا، میاں بشیر نے دونوں کتابیں لے جا صاحب کے حوالہ کیں۔ انھوں نے الٹ پلٹ کر کچھ پڑھا اور بشیر سے کہا "ہم یہ کتابیں لیجائیں گے کل بھجوادیں گے۔" انھوں نے کہا "لے جائیے، کل ہم کو چھٹی رہے گی"۔ میں جو ڈیرے میں آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ قیامت مچ رہی ہے۔ لڑکی نے رو رو کر آنکھیں لال کر لیں ہیں، میاں بشیر ڈرے سہمے ڈیرے کے ایک کونے میں دبکے بیٹھے ہیں۔ میرا اندر قدم رکھنا تھا کہ فریاد کی صدا بلند ہوئی۔ صاحبزادی نے رو رو کر اس طرح واقعہ بیان کیا جس طرح کسی عزیز کے مرنے کا کوئی بین کرتا ہے، میں نے بشیر کو بلایا وہ ڈرے کہ کہیں ٹھکائی نہ ہو جائے۔ پہلے ہی سے بسورنا شروع کیا، وہ دبلے جاتے تھے اور بہن شیر ہوتی جاتی تھی، آخر بڑی مشکل سے اتنا معلوم ہوا کہ ایک انگریز دونوں کتابیں لے کر چلا گیا، میں نے جا کر سائیس سے پوچھا کہ وہ انگریز کون تھا تو معلوم ہوا کہ سامنے جو ڈیرے پڑے ہیں ان میں وہ اترے ہیں۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کہ بھلا ڈائرکٹر صاحب کو بچوں کی کتابوں سے کیا کام، خیر لڑکی کو دلاسا دیا کہ میں لا دوں گا، نہیں تو دوسری لکھ دونگا، اس

نے کہا کہ میں لوں گی تو وہی کتاب لونگی بڑی مشکل سے اس کا غصّہ ٹھنڈا کیا، اب فکر ہوا کہ صاحب سے پوچھوں تو کیونکر پوچھوں، سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ صاحب کا مطلب اس طرح بچوں کی کتابیں منگوانے سے کیا ہوسکتا ہے۔ غرض اسی شش و پنج میں صبح ہوگئی کوئی سات بجے ہوں گے کہ صاحب کا چپراسی آیا اور کہا کہ صاحب سلام بولتے ہیں وہاں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ صاحب بیٹھے "مراۃ العروس" پڑھ رہے ہیں، سلام کرکے کرسی پر بیٹھ گیا۔ صاحب نے کہا، مولوی صاحب آپ نے ایسی مفید اور دلچسپ کتابیں لکھیں اور طبع نہ کرائیں اگر کل آپ کا لڑکا مجھ کو نہ ملتا تو شاید کوئی بھی ان کتابوں کو نہ دیکھتا اور چند ہی روز میں بچوں کے ہاتھوں یہ کتابیں پھٹ پھٹا کر برابر ہوجاتیں اگر آپ اجازت دیں تو "مراۃ العروس" کو سرکار میں پیش کردوں۔ آج کل گورنمنٹ ایسی کتابوں کی تلاش میں ہے جو لڑکیوں کے نصاب تعلیم میں داخل ہوسکیں" میں نے کہا "آپ کو اختیار ہے" یہ کہہ کر میں چلا آیا۔ صاحب نے وہ کتاب گورنمنٹ میں پیش کردی، وہاں سے انعام ملا، یہاں شیر کے منہ کو خون لگ گیا۔ اوپر تلے کئی کتابیں گھسیٹ ڈالیں جو کتاب لکھی اس پر انعام جو لکھا وہ پسند کیا گیا، غرض ہم مصنف بھی بن گئے اور ساتھ ہی ڈپٹی کلکٹر بھی ہوگئے۔ مگر کھٹی بات یہ ہے کہ انسان کا عہدہ جتنا بڑھتا جاتا ہے اسی طرح اس کی فرصت کا وقت بھی گھٹتا جاتا ہے یہی مصیبت ہم پر پڑی، اِدھر کام کی زیادتی، اُدھر سر سید کی فرمائشوں کی بھرمار، آج یہاں لکچر دیا، کل وہاں دیا، تصنیف کا سلسلہ ہی ٹوٹ گیا، خدا خدا کرکے بڑھاپے میں فرصت ملی تو قرآن شریف حفظ کرلیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ شوق ہوا کہ اس کا ترجمہ بھی کرلو، لوگوں کو بھی مفید ہوگا اور شاید تمہاری نجات کا بھی ذریعہ ہوجائے، غرض جتنی محنت ممکن تھی اتنی محنت کی، اسی ترجمہ

کے سلسلے میں "الحقوق والفرائض" کا مواد بھی جمع کر لیا، کلام مجید کی دعاؤں کو بھی ایک جگہ اکٹھا کر لیا۔ غرض ایک بنیتھ کئی کاج ہو گئے۔ مگر بھئی سچ کہنا "کیسا ترجمہ کیا ہے"، میں تو خاموش رہا مگر دانی نے کہا کہ "مولوی صاحب ہم کو اس ترجمے کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔" مولوی صاحب نے کہا "ہیں میاں دانی! یہ کیا کہا تم نے ابھی تک میرا ترجمہ نہیں دیکھا، بھئی غضب کیا، ارے میاں رحیم بخش ذرا اِدھر تو آنا، وہ سنہری جلد کی حمائل شریف ہے میاں دانی کو دیدو، بیٹا ذرا اس کو غور سے پڑھو، دیکھو تو میں نے اس بڑھاپے میں کیا محنت کی ہے۔" غرض حمائل شریف میاں دانی کے قبضہ میں آگئی۔ انھوں نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ یہ آپ کی یادگار رہے گی جب ہم اُٹھ کر چلنے لگے تو مولوی صاحب نے دانی سے کہا سے کہا "ارے بھئی ایک بات تو کہنی بھول گیا۔ اس حمائل شریف کا ہدیہ ساڑھے پانچ روپے ہے، کل ضرور لیتے آنا" بچارے کا شکریہ اکارت گیا اور دوسرے روز ساڑھے پانچ روپیہ مولوی صاحب نے دھروا لئے۔

مولوی صاحب نے کئی مرتبہ اس عاجز پر بھی رقمی حملے کئے لیکن یہ ذرا ٹیڑھا مقابلہ تھا۔ ایک چھوڑ کئی کتابیں مولوی صاحب سے اینٹھیں کبھی ایک پیسہ نہ دیا، یہ نہیں کہ خدانخواستہ وعدہ کرتا اور رقم نہ دیتا، میں اس وقت تک کتاب لیتا ہی نہ تھا جب تک مولوی صاحب خود نہ فرما دیتے کہ "اچھا بھئی تو یونہی لے جا، مگر میرا پیچھا چھوڑ"، میری ترکیب یہ تھی کہ پہلے کتاب پر قبضہ کرتا، مولوی صاحب قیمت مانگتے میں حجّت کرتا، وہ جواب دیتے، میں اس کا جواب دیتا، غرض بہت کچھ جھک جھک کے بعد تھک کر کہتے کہ جاؤ میں نے قیمت معاف کی آئندہ میری کسی کتاب کو ہاتھ لگایا تو اچھا نہ ہوگا، مگر خدا غریقِ رحمت کرے ہمیشہ کوئی نہ کوئی کتاب مجھ کو دیدیتے تھے اور جان بوجھ کر

جھگڑتے تھے۔ ریویو کے لئے جو کتابیں آتیں۔ وہ تو ہمارے باپ دادا کا مال تھیں، وہ پورا ریویو لکھنے بھی نہ پاتے کہ کتاب کے صفحہ اوّل پر میرا نام درج ہو کر شہادت دستاویزی اور ثبوت قبضہ کی شکل اختیار کر لیتا اس وقت بھی میرے پاس اس زمانے کی بعض کتابیں موجود ہیں۔ معلوم نہیں کہ میاں دانی کو جو حمائل شریف عطا ہوئی تھی وہ اُن کے پاس رہی یا نہیں، کتابیں تو کتابیں میں نے مولوی صاحب کی ایل۔ ایل۔ ڈی کی گون پر قبضہ کرنے کا فکر کیا تھا، ہوا یہ کہ جب میں اور دانی۔ بی اے میں پاس ہوئے تو جلسۂ تقسیم اسناد کے لئے لاہور جانا پڑا، گون منوانا بے ضرورت سمجھا گیا، اب خیال ہوا کہ گون کس سے کس کی چھینیں۔ دانی کو تو گون مل گئی میں نے مولوی صاحب کی گون تاکی ہم دونوں مل کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی ضرورت کا اظہار کیا، کہنے لگے "بیٹا میری گون بڑی قیمتی ہے، ساڑھے چھ سو روپے میں دو گونیں پڑی ہیں بھلا میں کیا خریدتا۔ یہ میاں مشرف نے میرے سر منڈھ دیں، وہ ایڈنبرا میں پڑھتے تھے۔ مجھے لکھا کہ اپنی تمام تصنیفات و تالیفات کی نہایت عمدہ جلدیں بندھوا کر بھجوا دیجئے، سر ولیم میور دیکھنا چاہتے ہیں، سر ولیم میور ممالک مغربی و شمالی کے لفٹننٹ گورنر تھے مجھ پر بھی بہت مہربان تھے میں نے مشرف کے لکھے کو سچ جانا، کتابوں کی جلد بندھوا ایڈنبرا روانہ کر دیں۔ ان کتابوں میں میرا کلام مجید کا ترجمہ بھی تھا وہ بہت پسند کیا گیا۔ سر ولیم میور نے یہ کتابیں ایڈنبرا یونیورسٹی میں پیش کر دیں اور وہیں گھر بیٹھے ایل۔ ایل ڈی کی ڈگری مل گئی مگر اس ڈگری کی اطلاع میرے پاس بعد میں آئی۔ پہلے ایک درزی کا خط اور بل آیا کہ مسٹر مشرف کی فرمائش کے بموجب ایل۔ ایل ڈی کی ایک سیاہ اور ایک سرخ گون مع ٹوپی کے روانہ کی گئی ہے۔ براہ کرم جس قدر جلد ممکن ہو ساڑھے چھ سو روپے روانہ فرمائیے میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ الٰہی یہ

کیا ماجرا ہے یا تو مشرف دیوانہ ہو گیا ہے یا یہ درزی پاگل ہے کہ بیٹھے بٹھائے بل روانہ کر
رہا ہے، یہ سوچ ہی رہا تھا کہ گون کا پلندہ بھی آ گیا۔ غرض اسی ششش و پنج میں ایک ہفتہ
گذر گیا، دوسری ڈاک سے ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری ملنے کا مراسلہ اور میاں مشرف کا خط
ملا؛ "قہر درویش بر جان درویش" درزی صاحب کو رقم روانہ کی، مشرف کو برا بھلا لکھا کہ
وہاں سے یہ تھیلے بنوا کر بھجوانے کیا ضروری تھے میں یہاں اپنے ناپ کی گون بنوا لیتا، بہرحال
یہ گونیں ساڑھے چھ سو روپے کی ہیں۔ معاف کیجئے میں نہیں دے سکتا، جا کسی پروفیسر کی
گون چھین کر کیوں نہیں لے جاتا۔ جو میرے پیچھے پڑا ہے" میں یہ قصہ چپکا بیٹھا سنتا رہا
اس کے بعد بغیر کچھ کہے سنے اٹھا اور مولوی صاحب کے سامان کی کوٹھری کا رخ کیا۔ وہ
"ہاں ہاں" کہتے ہی رہے۔ میں نے کنڈی کھول اندر گھس الماری میں سے کالی گون نکال ہی
لی۔ جب مولوی صاحب نے دیکھا کہ پانی سر سے گذر گیا تو سنبھل سنبھلا کر اٹھے میں اتنی دیر
میں دروازہ بند کر، گون بغل میں مار پھر اپنی جگہ آ گیا۔ مولوی صاحب بھی بیٹھ گئے اور اب
انھوں نے گون کی قیمت، میری لاپروائی، ریل میں چوری کے خطرات۔ بی۔ اے اور ایل ایل
ڈی کی گون کے اختلاف، غرض اسی طرح بیسیوں چیزوں پر لکچر دے ڈالے۔ مگر میں بیٹھا
سنتا رہا۔ جب وہ کہتے کہتے تھک گئے تو میں نے لکچر شروع کیا، استادوں کی غیبت، اپنی
غربت، گون کی صرف ایک روز کی ضرورت۔ وقت کی قلت، غرض دس بارہ پہلوؤں پر میں
نے بھی اسپیچ دیدی اور آخر میں صاف کہدیا کہ یہ گون میں لے کر جاؤنگا اور ضرور لے کر جاؤنگا
اس کے بعد مولوی صاحب کچھ نرم پڑے، کہنے لگے "واپس کب کرو گے" میں نے کہا "آپ
سرخ گون پہنتے ہیں، کالی گون مجھے دیدیجئے، آپ کا کچھ نقصان نہ ہوگا اور ایک غریب کا
فائدہ ہو جائے گا" مولوی صاحب نے کہا "نہیں بیٹا لاہور سے آ کر دے دیجیو، مجھے

دربار وغیرہ میں یہ گون بھی پہننی پڑتی ہے" یہ الفاظ انھوں نے کچھ ایسے لہجے میں کہے کہ مجھے بھی وعدہ ہی کرتے بن پڑی۔ آخر میں گون لے کر گیا اور لاہور سے آکر واپس کر دی، جب مولوی صاحب نے گون پر قبضہ کر لیا، اس وقت بہت خفا ہوئے، کہنے لگے "اب کے تو اگر میری کوٹھری میں گھسا تو اچھا نہ ہوگا، کل کو میرا کیش بکس اٹھا کر لے جائے گا، خیر دانی گون لے جاتا تو کچھ حرج نہ تھا، کیونکہ واپسی کی تو اُمید رہتی، مجھے کب اُمید تھے کہ آپ بزرگ واپس بھی کرینگے وہ تو کہو میرا حلال کا مال تھا جو واپس آگیا" میں نے کہا "مولوی صاحب اگر پہلے سے معلوم ہو جاتا کہ آپ کو گون کی واپسی کی توقع نہیں ہے تو آپ اس کی تمام عمر شکل بھی نہ دیکھتے"۔ ہنس کر کہنے لگے چلو "مشتے بعد از جنگ" کی صورت ہے۔ آئندہ میں دینے میں احتیاط کروں گا اور تم واپسی میں احتیاط کرنا" اس وقت تو یہ باتیں ہنسی میں ہوئیں مگر اب افسوس ہوتا ہے کہ گون اگر میرے پاس رہ جاتی تو مولوی صاحب کی یادگار رہتی، کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ وہ گون میرے پاس بھیجدے، کیونکہ اس میں میرا بھی حق ہے، یہ ضرور ہے کہ وہ گون مولوی صاحب نے مجھ کو دی تو نہ تھی لیکن وہ سمجھ چکے تھے کہ یہ ہاتھ سے گئی میری غلطی تھی جو اس کو لے جا کر واپس کیا۔ اب اگر مل گئی تو کبھی ایسی غلطی نہ کروں گا۔

جس طرح مسٹر مشرف نے یہ گونیں مولوی صاحب کے گلے منڈھی تھیں اسی طرح نواب محسن الملک نے حیدرآباد میں فرنیچر ان کے سر چپیک دیا تھا۔ اس زمانے میں حیدرآباد میں نواب محسن الملک کا طوطی بول رہا تھا، ان کی تجویز اور سر سید کی تحریک پر مولوی صاحب حیدرآباد آئے۔ پہلے نواب محسن الملک ہی کے ہاں قیام کیا، اس کے بعد علیحدہ کوٹھی میں جا رہے ہندوستانی وضع کا سامان، تخت چوکیاں وغیرہ خرید لیں، بھلا

محسن الملک یہ کیوں کر دیکھ سکتے تھے کہ ان کا دوست پُرانی وضع کے لوگوں کی طرح زندگی بسر کرے، ایک روز سکندرآباد جا ایلین اینڈ کمپنی کو کئی ہزار کے فرنیچر کا آرڈر دیدیا اور کہدیا کہ مولوی صاحب کے ہاں پہنچا دو اور بل بنا کر بھیجدو، ایک روز جو مولوی صاحب اُٹھتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ چھکڑے پر چھکڑا، فرنیچر کا لدا کوٹھی کے باہر کھڑا ہے، بہت چکرائے لینے سے انکار کردیا، مگر وہ نواب محسن الملک کا پڑھایا ہوا جن تھا، وہ کب ماننے والا تھا، آخر لاچار گھر چھوڑ باہر آبیٹھے اور دن بھر میں مولوی صاحب کا مکان صاحب بہادر کی کوٹھی ہو گیا، مگر یہ بھی نذیر احمد صاحب تھے، کچھ ایسی چال چلے کہ جب ان کا تقرر پٹنچر د کی صدر تعلقداری پر ہوا تو وہ سب کا سب سامان بہت ہی تھوڑی کمی پر ایلین کے سر مارا پٹنچر د وہی اپنے پرانے تخت وغیرہ لے گئے، نواب محسن الملک کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوئی۔

اب آگے کی داستان بڑی دلچسپ ہے، نواب محسن الملک دورے پر نکلے، پٹنچر د قیام کیا، مولوی صاحب خود کہیں دورے پر گئے ہوئے تھے۔ نواب صاحب نے گھر میں کہلا بھیجا کہ "میں آیا ہوں میرے قیام کا انتظام کردو"۔ ایک کمرہ جس میں دو تین کرسیاں، ایک دو میزیں تھیں کھول دیا گیا وہ ایلین والے فرنیچر کی تلاش میں تھے، سمجھے کہ مولوی صاحب نے اپنے کمرے میں سجا رکھا ہوگا اندر کہلا بھجوایا کہ "میں مولوی صاحب کے کمرے میں ٹھیروں گا" پہلے تو جواب ملا کہ وہاں آپ کو تکلیف ہوگی، مگر جب اِدھر سے اصرار ہوا تو وہ کمرہ بھی کھول دیا گیا، اندر جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ وہاں صفاچٹ میدان ہے، نہ دری ہے نہ چاندنی، نہ میز ہے نہ کرسی، کمرے کے بیچ میں ایک چھوٹا سا تخت ہے اس پر ایک چھوٹا سا کمبل پڑا ہوا ہے، بازو میں ایک چوکی پر رحل اور جانماز رکھی ہے کھونٹی پر کلام مجید لٹک رہا ہے۔ یہ بہت چکرائے، لوگوں سے پوچھا وہ فرنیچر کہاں گیا، معلوم

ہوا کہ آتے آتے مولوی صاحب اس کے کوڑے کرآئے۔ بچارے ایک رات ٹھہرے اور صبح ہی کوچ بول دیا۔

کچھ عرصے تک تو نواب محسن الملک اور ان کی بنی رہی بعد میں ایسی کھنچی کہ ٹوٹ گئی مولوی صاحب کو یہ شکایت تھی کہ محسن الملک مجھ پر دباؤ ڈال کر کام نکالنا چاہتے ہیں محسن الملک کو یہ شکایت تھی کہ مولوی صاحب میرے مخالف ہو کر میرے اکھاڑنے کی فکر میں ہیں۔ غرض جب عماد السلطنت کا زمانہ آیا اور محسن الملک بہادر کی کمان چڑھی تو مولوی صاحب کو میدان سے ہٹ جانا ہی مناسب معلوم ہوا۔ دوسرے حیدر آباد میں صحبت کا جو رنگ تھا وہ ایسا نہ تھا جس میں مولوی صاحب کا رنگ جم سکتا۔ اس زمانے کے جو حالات مولوی صاحب بیان کیا کرتے تھے ان کا زبانِ قلم پر نہ آنا ہی زیادہ مناسب ہے، بعد میں دونوں بظاہر ملتے جلتے تھے لیکن موقعہ پڑتا تو ایک دوسرے کو پردے ہی پردے میں سنائے بغیر نہ رہتے تھے۔ ایک واقعہ تو خود میری آنکھوں کے سامنے گزرا ہے سنہ ۱۹۰۳ء کے دربار کے موقع پر کانفرنس کا اجلاس دہلی میں اجمیری دروازے کے باہر ہوا۔ اس زمانہ میں نواب محسن الملک علی گڈھ کالج کے سکریٹری تھے۔ کانفرنس کے صدر ہز ہائی نس سر آغا خان تھے۔ آدمیوں کی کثرت تھی کہ بیٹھنے کو پنڈال میں جگہ نہ ملتی تھی، ہر جلسہ میں کئی کئی رئیس آجاتے تھے، ایک پورا دن خاص مولوی صاحب کے لکچر کے لئے مقرر ہوا، مدت ہوئی تھی کہ مولوی صاحب نے پبلک میں لکچر دینا چھوڑ دیا تھا، اس روز جو معلوم ہوا کہ مولوی صاحب لکچر دیں گے خلقت ٹوٹ پڑی، لکچر شروع ہوا تھا کہ لارڈ کچنر نے کہلا بھیجا کہ آج میں بھی آؤں گا، نواب محسن الملک نے ایسے باوقعت اور ذی وجاہت مہمان کے استقبال کی تیاریاں شروع کیں، مولوی صاحب کے

لکچر میں اس سے کھنڈت پڑتی تھی۔ پنڈال کے باہر گڑبڑ ہوئی اور نواب محسن الملک سمجھے کہ لارڈ کچنر آئے۔ اُٹھ کر باہر جاتے اور پھر آبیٹھتے اسی طرح وہ کوئی دس پندرہ دفعہ باہر گئے اور اندر آئے، مولوی صاحب بہت جز بز ہوئے، خفا بھی ہوتے مگر ان کی کون سنتا تھا۔ قصہ مختصر آخر لارڈ کچنر آہی گئے، نواب محسن الملک نے سب کا تعارف کرایا۔ مولوی صاحب نے خود اپنا تعارف کرایا۔ لارڈ کچنر کہنے لگے "مولوی صاحب ہم نے کورس میں آپ کی کتابیں پڑھی ہیں، آج آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی"۔ مولوی صاحب نے کہا "لاٹ صاحب مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی اور سب سے بڑی یہ خوشی ہوئی کہ آپ کی وجہ سے ایک معمہ حل ہو گیا" لارڈ کچنر نے کہا "وہ کیا معمہ تھا؟" مولوی صاحب نے کہا "ہمارے ہاں قیامت کی نشانیوں میں لکھا ہے کہ اس وقت ایسا تہلکہ ہوگا کہ حاملہ عورتوں کے حمل گر جائیں گے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ ایسی کیا مصیبت ہوگی کہ حمل گرا دیگی، مگر آج یقین آگیا کہ جو کچھ لکھا ہے صحیح لکھا ہے۔ جب آپ کی آمد نے بڑے بڑے پیٹ والے بڈھوں کے حمل گرا دیئے تو کیا تعجب ہے کہ قیامت کی آمد عورتوں کے حمل گرا دے"۔ تمام پنڈال میں سناٹا ہو گیا مگر مولوی صاحب کو جو کچھ کہنا تھا کہہ گئے اور اس طرح اپنے دل کا بخار نکال لیا۔ بات یہ ہے کہ مولوی صاحب کو وقت پر ایسی سوجھتی تھی کہ باید و شاید، چنانچہ امیر حبیب اللہ خاں ہی کے دربار کا واقعہ دیکھ لو۔

امیر حبیب اللہ خاں بقرعید کے دن دہلی میں تھے۔ اس روز جمعہ تھا صبح کو بقرعید کی نماز عیدگاہ میں پڑھی اور جمعہ کی نماز جامع مسجد میں، شام کو سرکٹ ہاؤس میں دربار کیا، اس دربار میں آٹھ یا نو دہلی کے ہندو امیر اور اسی قدر مسلمان مشاہیر بلائے گئے۔ ان میں ایک مولوی صاحب بھی تھے، سر ہنری میک موہن نے ان لوگوں کا تعارف

امیر صاحب سے کرایا۔ جب مولوی صاحب کی باری آئی اور ان کی تعریف سرہنری نے کی تو امیر صاحب نے کہا "آپ کو ان کی تعریف کرنے کی ضرورت نہیں میں خود ان کی تصانیف بڑے شوق سے پڑھتا ہوں اور تقریباً سب کا ترجمہ بھی کرا چکا ہوں، دیکھنے کا اشتیاق تھا وہ آج پورا ہو گیا" اس کے بعد باتوں ہی باتوں میں پوچھا "آپ شعر بھی کہتے ہیں" مولوی صاحب نے کہا "جی ہاں کہتا ہوں لیکن آج آپ کی تعریف میں اپنا نہیں دوسروں کا شعر سناؤں گا، یہ کہہ کر متنبّی کا یہ شعر پڑھا ؎

عید و عید و عید مجتمعًا   وجہ الحبیب و یوم العید والجمعا

موقع کے لحاظ سے یہ ایسا برمحل ہو گیا کہ متنبّی کو نصیب بھی نہ ہوا ہو گا۔ واقعات اور خاص کر حبیب کے لفظ نے شعر میں جان ڈال دی۔ تمام دربار پھڑک اٹھا۔ امیر حبیب اللہ خاں نے اٹھ کر مولوی صاحب کو گلے سے لگا لیا اور اتنے بوسے لئے کہ مولوی صاحب گھبرا گئے۔ دوسرے روز جو انھوں نے اس واقعہ کا ذکر ہم سے کیا اس کو انھیں کے الفاظ میں دہرانا اچھا معلوم ہوتا ہے کہنے لگے "بھئی میں تو شعر پڑھ کے مصیبت میں پھنس گیا، شعر پڑھنا تھا کہ یہ معلوم ہوا کسی شیر نے آکر مجھے دبوچ لیا۔ اس میرے شیر کا کوئی سوا گز چوڑا سینہ میں ٹھہرا چھوٹے قد کا آدمی، اس نے جو پکڑ کر بھینچا تو ادھر تو ہڈیاں پلپلی ہو گئیں اُدھر دم گھٹنے لگا۔ اس کی گرفت سے نکلنے کی ہزار کوشش کرتا ہوں، جنبش تک نہیں ہوتی، قسم خدا کی اس وقت تک ہڈیوں میں درد ہو رہا ہے۔ بارے خدا خدا کر کے گرفت ڈھیلی ہوئی تو میں ذرا علیحدہ ہوا ابھی پوری طرح سانس بھی نہ لینے پایا تھا کہ اس نے میرے گلے میں باہیں ڈال بوسے پر بوسہ لینا شروع کیا، بھلا مجھ بڈھے کو دیکھو اور امیر صاحب کی اس حرکت کو دیکھو"

یہ کچھ تعریف کا یہ طریقہ افغانستان ہی میں اچھا معلوم ہوتا ہوگا، مجھے تو مارے شرم کے پسینے چھوٹ گئے۔ وہ اللہ کا بندہ ذرا دم لیتا اور سبحان اللہ کہہ کر پھر لپٹ جاتا، لپٹتا اور لپٹتے ہی بوسہ پر بوسہ لینا شروع کرتا، بے چارے دوسرے بھلے آدمی بیٹھے ہوئے کیا کہتے ہوں گے جب میں نے اس مصیبت سے رہائی پائی تو میری ناک سے پسینہ اس طرح بہہ رہا تھا جس طرح کسی ٹوٹی صراحی سے پانی رستا ہے، نا بھائی نا ایسے دربار کو میرا دور ہی سے سلام ہے، کون شعر پڑھ کر اپنی ہڈیاں تڑوائے" مولوی صاحب گو اپنی ہڈیاں سہلاتے جاتے اور یہ قصہ بیان کرتے جاتے تھے، مگر ان کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ خوشی کے مارے دل کھلا جا رہا ہے اور سمجھ رہے ہیں کہ شعر کی داد اس طرح اور اس رنگ میں آج تک نہ کسی شاعر کو ملی ہے اور نہ ملے گی۔

اس تیزی طبع کے ساتھ صاف گوئی بھی بلا کی تھی، جو کہنا ہوتا تھا وہ بغیر کہے نہ رہتے تھے، اس میں کسی لفٹنٹ گورنر پر ہی حملہ کیوں نہ ہو جائے۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں لارڈ کرزن کا ایک لکچر ہوا اور اس میں انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ جب تک ہندوستانی یورپ والوں کی طرح سچ بولنے کی عادت نہ ڈالیں گے اس وقت تک ہندوستان ترقی نہیں کر سکتا اخباروں میں یہ لکچر پڑھ کر مولوی صاحب کو بڑا غصہ آیا، خدا کی قدرت دیکھو کہ اس کے چند ہی روز بعد ہمارے کالج میں سالانہ جلسہ ہوا اور لارڈ لیفرائے جو ہندوستان کے لاٹ پادری تھے تشریف لائے۔ شامتِ اعمال سے انھوں نے بھی اپنے لکچر کا موضوع یہی قرار دیا۔ کالج کی طرف سے لارڈ صاحب کا شکریہ ادا کرنے کے لئے مولوی صاحب تجویز کئے گئے اب کیا تھا "اللہ دے اور بندہ لے"، جو کچھ دل میں بخار بھرا تھا خوب اچھی طرح نکال لیا۔ کالج والے حیران تھے کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے مولوی صاحب شکریہ

ادا کر رہے ہیں بالاٹ صاحب پر اعتراضات ۔ مگر انھوں نے جب تک اپنے دل کی بھڑاس اچھی طرح نہ نکال لی خاموش نہیں ہوئے، سب سے پہلے انھوں نے ہندوستان کے مغربی اثر کو نہایت پر مذاق پہلو سے بیان کیا فرمانے لگے حضرات پیجامہ اچھا ہے یا پتلون ۔ ہم پرانے آدمی تو موسم کے لحاظ سے، اٹھنے بیٹھنے کی سہولت و آرام کے لحاظ سے پیجامہ ہی کو اچھا کہیں گے، مگر آج کل کے ہندوستانی صاحب بہادر پتلون کا ساتھ دیں گے، یہ کیوں؛ اس لئے کہ یہ انگریزوں کا پہناوا ہے، ہم اچکن یا انگرکھے کو اچھا کہیں گے، اس سے ستر ڈھکتا ہے، آدمی بھاری بھرکم معلوم ہوتا ہے، ہمارے یورپ کے دلدادہ بھائی کوٹ کو پسند کریں گے، کیوں، اس لئے کہ یہ انگریزوں کا پہناوا ہے ہم بڈھے سلیم شاہی جوتی پر جان دیں گے، کیونکہ اس میں پیر کو آرام ملتا ہے نرم نرم اور سبک ہوتی ہے، ہمارے فیشن کے عاشق فل بوٹ کا انتخاب کریں گے، یہ کیوں؟ اس لئے کہ انگریزوں کا پہناوا ہے، ہمارے پاس اپنی پرانی ہر چیز کے اچھے ہونے کا ثبوت موجود ہے، ان کے پاس صرف ایک جواب ہے کہ یورپ والے ایسا ہی پہنتے ہیں اور رکھی ہے بھی یہی بات، قسمت نے ہم کو انگریزوں کا ماتحت کر دیا ہے، ان کی ہر چیز ہمارے لئے قابلِ تقلید ہے اور ان کا ہر فعل ہمارے لئے چراغِ ہدایت، اب افعال سے گذر کر اقوال تک نوبت آ گئی ہے پادری کرزن تھوڑے ہی دن ہوئے فرما چکے ہیں کہ ہندوستانی سچ چھوڑ دو اور انگریزی سچ بولا کرو۔ آج ہمارے پادری لیفرائے بھی ان کے ہمنوا ہوئے ہیں۔ یا تو انھوں نے یہ سمجھا ہے کہ یہاں کے سچ اور یورپ کے سچ میں فرق ہے اور وقت آ گیا ہے کہ پیجامے کی طرح ہندوستانی سچ کو اتار پھینک دیا جائے اور پتلون کی طرح ولایتی سچ پہن لیا جائے، یا ان کا یہ خیال ہے کہ ہندوستان کے کسی مذہب نے سچ کی تلقین

ہی نہیں کی ہے اور یہ نیا مال دساور ہو کر ولایت سے آیا ہے، بہرحال کچھ بھی ہو، اب تمہارے پرانے سپیچ کی قدر نہیں رہی ہے۔ خدا کے لئے اگر اپنا بھلا چاہتے ہو تو اُن لاٹ صاحبوں کا حکم مانو، یہ بڑے لوگ ہیں مولوی نذیر احمد یا پنڈت بانکے لال نہیں ہیں کہ انھوں نے ہندوستانی سپیچ بولنے کی ہدایت کی اور تم نے ہنس کر ٹال دیا، لاٹ صاحبوں کی بات نہ مانوگے اور ولایتی سپیچ نہ بولوگے اور یہ تازہ مال استعمال نہ کروگے تو یاد رکھو کہ نوکری ملنی مشکل ہو جائے گی اور نوکری نہ ملی تو روٹیوں کو محتاج ہو جاؤگے، کیونکہ دونوں لاٹ صاحبوں نے یہ ہدایت نہیں کی ہے کہ نوکری کا خبط چھوڑ دو اور تجارت یا صنعت و حرفت اختیار کرو، اسی سے تمہارے دلدّر دور ہوں گے۔"

آخر میں مولوی صاحب نے تھوڑا بہت لارڈ ڈیفرائے کا شکریہ بھی ادا کر دیا۔ لاٹ صاحب اُردو بہت اچھی جانتے تھے، مولوی صاحب کی اس پرمذاق تقریر پر مسکراتے رہے مگر دل کا خدا ہی مالک تھا، کالج کے منتظمین کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں، مگر یہاں تیر از کمان جستہ کی صورت تھی کیا کر سکتے تھے۔ البتہ دل میں انھوں نے ٹھان لی ہوگی کہ آئندہ مولوی صاحب کو شکریہ ادا کرنے کی تکلیف نہ دینا ہی مناسب ہے۔

اس واقعہ کے کچھ ہی دنوں بعد میں حیدرآباد چلا آیا۔ پھر دو دفعہ دہلی میں مولوی صاحب سے میرا ملنا ہوا۔ پہلی دفعہ جو ملا تو یہ وہ زمانہ تھا کہ "امہات الامہ" کی وجہ سے مولوی صاحب پر بڑی لے دے ہو رہی تھی۔ میں نے بھی اس کا ذکر چھیڑا، کہنے لگے "بھئی مجھے تو اس کتاب میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی جس کی وجہ سے لوگ اس طرح برانگیختہ ہو جائیں، تم نے بھی یہ کتاب دیکھی ہوگی۔ آخر تم ہی بتاؤ اس میں میں نے ایسی کونسی نئی بات لکھی ہے،، میں نے خود "امہات الامہ" نہیں دیکھی تھی مگر میں مولوی صاحب کے

طرزِ تحریر سے واقف تھا اس لئے میں نے یہی کہا کہ مولوی صاحب آپ کا طرزِ تحریر مذاق کا پہلو لئے ہوئے ہوتا ہے، وہ کچھ قصہ کہانیوں ہی میں مزا دیتا ہے، تاریخ کی کتابوں اور خاص کر مذہبی معاملات میں وہ کسی طرح کھپ نہیں سکتا اگر لوگوں کو اعتراض ہوگا تو آپ کی طرزِ تحریر ہی کے متعلق ہوگا۔" مولوی صاحب نے کہا "میرے کلام مجید کے ترجمہ متعلق تو یہ اودھم نہیں مچا۔" میں نے کہا "اس پر بھی لوگوں کے اعتراض ہیں مگر اس میں آپ کا معاملہ اللہ میاں سے ہے اور یہاں انسانوں سے، مشہور مقولہ ہے۔

باخدا دیوانہ باش   و با محمد ہوشیار

کچھ سوچتے رہے پھر کہنے لگے "ہاں بیٹا کہتے تو سچ ہو، اس قسم کی تالیفات میرے دائرہ تحریر سے باہر ہیں، انشاءاللہ دوسرے اڈیشن میں اس نقص کو رفع کر دوں گا۔" جب میں چلنے لگا تو فرمایا "کہو بیٹا پھر ملوگے، ابھی تو تمہارے جانے میں بہت دن ہیں۔" میں نے کہا "انشاءاللہ ضرور آؤں گا۔" ہنس کر کہنے لگے "انشاءاللہ کہنے کے بعد تم ضرور آئے، مسلمانوں کو جب کوئی کام کرنا ہوتا ہے تو ہزاروں قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ یہ کام میں ضرور کروں گا مگر جب کسی کام کے کرنے کو جی نہیں چاہتا تو ہمیشہ یہی کہا کرتے ہیں کہ انشاءاللہ ضرور کروں گا۔ ہم تو اس کے یہ معنی سمجھتے ہیں کہ اس کام کے کرنے کا تو ارادہ نہیں ہے ہاں اگر خدا نے چاہا اور زبردستی یہ کام کرا دیا تو مجبوراً کرلیں گے۔" میں نے کہا "مولوی صاحب آپ کو انشاءاللہ کے یہ معنی پہنانے مناسب نہیں ہیں آپ مذاقیہ پہلو مذہبی معاملات میں بھی نہیں چھوڑتے۔" کہنے لگے "پہلے انشاءاللہ کے معنی دوسرے تھے، آجکل کے مسلمان وہی معنی لیتے ہیں جو میں نے بیان کئے۔" خدا کی قدرت دیکھو کہ اسی رات کو عین میرے پلنگ کے نیچے طاعون کا چوہا مرا اور صبح ہی کے میل سے میں ایسا دہلی سے بھاگا کہ حیدرآباد آکر دم لیا۔

دوسری دفعہ جو میں ملا تو مولوی صاحب کی صحت جواب دے چکی تھی۔ چھت پر جو چھوٹا کمرہ تھا اس میں آرہے تھے رعشہ میں اضافہ ہوگیا تھا اور آنکھوں سے بھی کم دکھائی دیتا تھا۔ پلنگ پر بیٹھے رہا کرتے تھے۔ میں نے کمرے کے دروازے میں قدم رکھتے ہی بڑی زور سے سلام کیا کہنے لگے "ہیں یہ کون صاحب ہیں؟" میں نے کہا "میں" "ہوں، پھر آخر میں کون صاحب ہوئے، نام کیوں نہیں بتاتے، ارے بھئی اب مجھے صاف نہیں دکھائی دیتا ذرا قریب آؤ" میں نے کہا "واہ مولوی صاحب واہ، اگر آواز سے نہیں پہچانا تو خوب پہچانا دور سے پہچانئے تو بات ہے"۔ ایک دفعہ ہی ہنس پڑے اور کہنے لگے "اوہو مرزا فرحت صاحب ہیں، بھلا اور کون یہ بے تکی باتیں کرے گا، آؤ بیٹا اب کے تو کئی برس کے بعد آئے"۔ میں پاس گیا، گلے لگایا، حالات پوچھتے رہے، باتیں کرتے کرتے کہا "ذرا دیکھنا بھئی گھڑی میں کیا بجا ہے" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا "ساڑھے نو میں پانچ منٹ ہیں" کہنے لگے "اوہو دیر ہوگئی۔ ذرا میرا جوتا اور جرابیں تو لے آؤ"۔ میں نے لاکر جرابیں پہنائیں، جوتا سوکھ کر لکڑی ہوگیا تھا وہ زبردستی پاؤں میں ٹھونسا، جوتا پہن کر کھڑے ہوگئے، میں نے کھونٹی پر سے اتار کر شیروانی اور ٹوپی دی، وہ پہن کر کہنے لگے "چلو بھئی وقت تنگ ہوگیا ہے"، میں نے کہا "مولوی صاحب آخر کہاں جانا ہے"۔ کہنے لگے "بیٹا آج ایک مقدمہ کی پیشی ہے وہاں جارہا ہوں، ذرا مجھ کو کشمیری دروازے تک تو لے چل" میرا ہاتھ پکڑ کر نیچے اترے، باہر دیکھوں تو کوئی سواری نہیں، میں نے کہا "مولوی صاحب خدا کے لئے اب اس عمر میں تو اس طرح پیدل نہ پھرا کیجئے، خدا نے سب کچھ دے رکھا ہے۔ آخر یہ کس دن کے لئے ہے، روپیہ اسی لئے ہوتا ہے کہ خرچ کیا جائے، بال بچوں کی طرف سے بھی بے فکری ہے پھر کیوں اس بڑھاپے میں آپ اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں، ذرا اپنی حالت کو دیکھئے اور کشمیری دروازے کو دیکھئے،

بہ دو میل جانا اور دو میل آنا آپ کو مضمحل کردے گا، ذرا ٹھہر جائیے میں گاڑی لے آتا ہوں"، بہت بگڑے اور کہنے لگے "تجھ کو میرے معاملے میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے، اب چلنا ہے تو چل، نہیں تو میں کسی اور کو بلاتا ہوں، ابھی میرے ہاتھ پاؤں نے ایسا جواب نہیں دیا ہے کہ کشمیری دروازے تک نہ جاسکوں"۔ میں نے کہا "مولوی صاحب خدا کے لئے اب تو گاڑی رکھ لیجئے، اگر آپ خرچ نہیں اُٹھاتے تو میں اُٹھاؤں گا"، ہنس کر کہنے لگے "کیوں نہ ہو روپیہ اُچھلنے لگا ہے، کیا میرے پاس اتنا روپیہ نہیں ہے کہ گاڑی نہ رکھ سکوں، بیٹیا بات یہ ہے کہ پہلے تو میں نے اس لئے گاڑی گھوڑا نہیں رکھا کہ سائیسوں سے ڈر لگتا تھا، ایک تو دانہ گھاس چراتے ہیں، دوسرے گھوڑے کی مالش نہیں کرتے، تیسرے گاڑی کا آج یہ توڑا، کل وہ توڑا، کون بیٹھے بٹھائے اپنی بھلی چنگی جان کو یہ عذاب لگائے اور دن رات کا فکر مول لے، رفتہ رفتہ پیدل پھرنے کی عادت ہوگئی، اب آخری عمر میں گاڑی کی ضرورت ہوئی تو گاڑی رکھتے ہوئے شرم آتی ہے لوگ کیا کہیں گے کہ تمام عمر تو مولوی صاحب جوتیاں چٹخاتے پھرے، اب بڑھاپے میں گاڑی پر سوار ہو کر پھرتے ہیں، نا بھئی نا، اب گاڑی رکھنا وضعداری کے خلاف ہے"۔ میں نے کہا "تو کمیشن ہی جاری کرا لیا ہوتا" کہنے لگے "وہ بھی میری وضعداری کے خلاف ہے، ہمیشہ کچہری میں جا کر گواہی دی، اب بڑھاپے میں اس وضعداری کو کیوں توڑوں؟" بہر حال یہی حجّت کرتے کچہری پہنچ گئے۔ ڈپٹی صاحب کو اطلاع ہوئی، انھوں نے مولوی صاحب کو اپنے کمرے میں بٹھایا اور سب سے پہلے انھیں کا مقدمہ لیکر ان کی شہادت قلمبند کی۔ اور یہ جس طرح گئے تھے اسی طرح ہانپتے ہانپتے میرا ہاتھ پکڑ کر گھر آئے۔

حیدرآباد آنے کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ اس چہکتے ہوئے بلبل نے اس گلشن دنیا سے کوچ کیا، جب کبھی دہلی جاتا ہوں تو مولوی صاحب کے مکان پر ضرور جاتا ہوں، اندر قدم نہیں رکھتا، مگر باہر بڑی دیر تک دیوار سے لگ کر دروازے کو دیکھا کرتا ہوں، اور رہ رہ کر ذوقؔ کا یہ شعر زبان پر آتا ہے ؎

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور سارے جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے
اللہ بس باقی ہوس

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی

مٹھو بھٹیارا
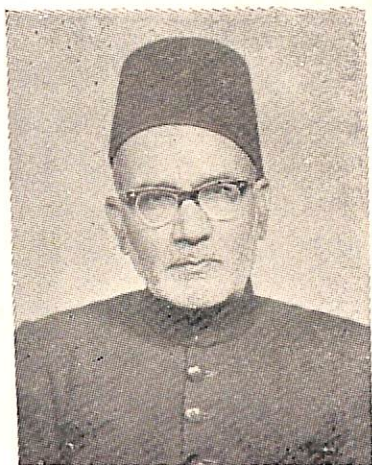
اشرف صبوحی دہلوی

اشرف صبوحی دہلوی

ولی اشرف نام صبوحی تخلص - ادبی دنیا میں اشرف صبوحی کے نام سے متعارف ہیں۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی رح کے خاندانِ اشرفی سے تعلق رکھتے ہیں۔ مولوی بشیر الدین صاحب خلف الرشید جناب مولوی ڈپٹی نذیر احمد صاحب مرحوم صبوحی صاحب کے حقیقی پھوپا تھے۔ صبوحی صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد حاجی حافظ سیّد علی اشرف صاحب سے حاصل کی۔ دہلی کے عربک ہائی سکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد علوم مشرقی کے حصول کا شوق ہوا۔ مدرسہ مسجد فتحپوری میں بھی کچھ عرصے عربی اور فارسی پڑھی۔ دہلی کے فارسی زبان کے چند مشاہیر علما سے فارسی کی کتابیں پڑھیں۔ خانگی مجبوریوں کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ منقطع کر کے ملازمت اختیار کرنی پڑی۔ مگر اس مصروفیت میں بھی علم کی چیٹک لگی رہی۔ فارسی اور اردو کے اعلیٰ امتحانات پاس کئے اور انگریزی میں بی۔ اے تک جا پہنچے۔

آپ کے پھوپھا مولوی بشیر الدین احمد صاحب مرحوم نے ہمّت افزائی کے خیال

سے صبوحی صاحب کی تقریظ اپنے کلام کے مجموعہ "دیوان بشیر" میں شائع کی جو ۱۹۲۴ء
میں خود انھوں نے اپنے کتب خانے سے چھپوایا۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں ارمغان کے نام
سے ایک ماہانہ ادبی رسالہ نکالا جسے ڈیڑھ سال کے بعد عدیم الفرصتی کی وجہ سے بند
کرنا پڑا۔ لیکن کہانیاں، افسانے اور مضامین وغیرہ لکھنے کا سلسلہ جاری رہا۔ جو
ملک کے ادبی رسائل میں چھپتے رہے۔ انگریزی سے اردو تراجم بھی کئے۔ 'سلمیٰ'
بن باسی دیوی۔ ننگی دنیا اور دھوپ چھاؤں نامی ناول اس کی یادگار ہیں۔
افسانوں کا ایک مجموعہ "جھروکے" کے نام سے ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا تھا۔ "دہلی کی
چند عجیب ہستیاں" خاکوں کا مجموعہ ہے جس کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔
بچوں کی کہانیوں کے بھی تقریباً چالیس کتابچے شائع ہو چکے ہیں۔ آپ کی تحریر کا
نمایاں وصف دِلّی کے محاورے اور روزمرّہ کا بے ساختہ استعمال ہے۔
سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو جانے کے بعد آج کل لاہور میں ہمدرد
نیشنل فاؤنڈیشن کے کلچرل سکریٹری کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

مٹھو بھٹیارہ

میاں مٹھو کا نام تو کچھ بھلا سا ہی تھا۔ کریم بخش یا رحیم بخش ٹھیک یاد نہیں، ڈھائی ڈھوئی کے مہینے سے پہلے کی بات ہے۔ ساٹھ برس سے اوپر ہی ہوئے ہوں گے۔ مگر ایک اپنی گلی والے کیا، جو انہیں پکارتا "میاں مٹھو"۔ بھٹیارے تھے۔ سرائے کے نہیں۔ دلّی میں محلّے محلّے جن کی دوکانیں ہوتی ہیں۔ تندور میں روٹیاں لگتی اور شوربا پائے اور اوجھڑی بکتی ہے۔ نان بائی اور نہاری والوں سے ان بھٹیاروں کو ذرا نیچے درجے کا سمجھنا چاہئے۔ تندور والے سب ہوتے ہیں۔ نان بائیوں کے یہاں خمیری روٹی بکتی ہے۔ یہ بے خمیری پکاتے ہیں۔ اِدھر آٹا گوندھا اور اُدھر روٹیاں پکانی شروع کردیں۔ پراٹھے تو ان کا حصہ ہیں۔ بعض تو کمال کرتے ہیں۔ ایک ایک پراٹھے میں دس دس پرت اور کھجلے کی طرح خستہ۔ دیکھنے سے منہ میں پانی بھر آئے۔ قورمہ اور کبابوں کے ساتھ کھائیے سبحان اللہ۔ باہمن کی بیٹی کلمہ نہ پڑھنے لگے تو ہمارا ذمہ۔

شاہ تارا کی گلی میں شیش محل کے دروازے سے لگی ہوئی میاں مٹھو کی دکان تھی۔ شیش محل کہاں، کبھی ہوگا۔ اس وقت تک آثار میں آثار ایک دروازہ وہ

بھی اصلی معنوں میں پھوٹا ہوا باقی تھا۔ نمونتہً یا بطور یادگار۔ اب تو ہمارے دیکھتے
دیکھتے وہ بھی صاف ہو گیا۔ اس کی جگہ دوسری عمارتیں بن گئیں۔ دروازہ تو گیا رہتا
دروازے کے دیکھنے والے بھی دو چار ہی ملیں گے۔ سنا ہے جاڑے، گرمی برسات محلّے
بھر میں سب سے پہلے میاں مٹھّو کی دکان کھلتی۔ منہ اندھیرے بغل میں مصالحہ کی پوٹلی
وغیرہ سر پر پتیلا، پیٹھ کے اوپر کچھ چھپٹیاں کچھ جھانگڑ لنگی میں بندھے ہوئے گنگناتے چلے آتے ہیں۔
آئے دکان کھولی، جھاڑو بہارو کی، تندور کھولا، ہڈیوں گڈیوں یا اوجھڑی کا ہنڈا نکالا
ہڈیاں جھاڑیں، اس کوٹھی کے دھان اس کوٹھی میں کئے یعنی گھر سے جو پتیلا لائے تھے
ہنڈے کا مال اس میں ڈالا، مصالحہ چھڑکا اور اپنے دھندے سے لگ گئے۔ سورج
نکلتے نکلتے سالن، نہاری، شوربا، جو کچھ ہو درست کر لیا۔ تندور میں ایندھن جھونکا۔
تندور گرم ہوتے ہوتے غریب غربا کام پر جانے والے روٹی پکوانے یا لگاون کے لئے
شوربا لینے آنے شروع ہو گئے۔ کسی کے ہاتھ میں آٹے کا طباق ہے تو کوئی مٹی کا پیالہ
لئے چلا آتا ہے اور میاں مٹھو ہیں کہ جھپا جھپ روٹیاں بھی پکاتے جاتے ہیں اور پتیلے
میں کھٹا کھٹ چمچہ بھی چل رہا ہے۔

میاں مٹھّو کی اوجھڑی مشہور تھی۔ دور دور سے شوقین منگواتے آنتوں اور معدے
کے جس مریض کو حکیم اوجھڑی کھانے کو بتاتے وہ یہیں دوڑا چلا آتا۔ کہتے ہیں کہ پراٹھے
بھی جیسے میاں مٹھّو پکا گئے پھر دلّی میں کسی کو نصیب نہ ہوئے۔ ہاتھ کچھ ایسا منجھا
ہوا تھا۔ تندور کا تاؤ کچھ ایسا جانتے تھے کہ مجال ہے جو کچا رہے یا جل جائے۔
سُرخ جیسے باقرخانی، سموسے کی طرح ہر پرت الگ نرم کہو تو لچی سے زیادہ نرم
بالکل ملائی۔ کرارا کہو تو پاپڑوں کی تھئی کھجلے کو مات کرے۔ پھر گھی کھپانے میں وہ

کمال کہ پاؤ سیر آٹے میں ڈیڑھ پاؤ گھی کھپادیں۔ ہر نوالے میں گھی کا گھونٹ۔ اور لطف یہ کہ دیکھنے میں روکھا۔ غریبوں کے پراٹھے بھی ہم نے دیکھے۔ دو پیسے کے گھی میں تر بتر بظاہر یہی معلوم ہوتا کہ ڈیڑھ پاؤ گھی والے سے دو پیسے والے پر زیادہ رونق ہے۔ اس ہنر کی بڑی داد یہ ملتی کہ غریب سے غریب بھی پراٹھا پکوا کر شرمندہ نہ ہوتا۔ پوسیری اور چھٹنکی پراٹھے دیکھنے والوں کو یکساں ہی دکھائی دیتے۔ مال دار اور مفلس کا بھید نہ کھلتا۔

پچھلے وقتوں میں ہر آدمی اپنی کھال میں رہتا۔ جس رنگ میں ہوتا وہی رنگ دکھاتا۔ جس قوم کا ہوتا وہی بتاتا۔ یہ نہیں کہ پیٹ سے زیادہ بلا اور ابھر گئے۔ ہیں اوباش اور صورت ایسی اختیار کی کہ لوگ صوفی کہیں، تھے مردھوں میں اللہ نے کام چلا دیا اب مرزا مغل کی اولاد ہونے میں کیا شک رہا۔ اللہ نے جیسا بنا دیا جس پیشے میں رزق اتار دیا۔ جو صورت بنا دی۔ اپنی شخصیت کی جھوٹی نمائش انسان کیوں کرے۔ جہاں ہو کیا وہاں شرافت نہیں دکھا سکتے؟ حلال خور، چمار، کنجڑے قصائی سب اپنے اپنے درجے میں شریف ہوتے ہیں۔ اچھے کام کرو۔ دین داری بھل منسائی کے ساتھ دوسروں سے پیش آؤ، حرام خوری پر کمر نہ باندھو یہی شرافت ہے "جنم کا اولیا، کرم کا بھوت، پہلے کپوت دوجے اچھوت،" اونچے خاندان میں سبھی تو فرشتے نہیں ہوتے ایک درخت کے بہت سے پھل کرڑ کھائے بھی نکل آتے ہیں۔ دھول کوٹ کی بعض کھچڑیاں ایسی مزیدار دیکھو گے کہ لکھنؤ کا چنلا پانی بھرے۔

کوئی پچاس برس ہوئے کلّن نفیری والا، گلزار بھانڈ، اچپل ہیجڑا، ننواں تیلی، اچّلا دھوبی، بنّی رنگریز، چپّو قصائی، چھوٹا گھوسی، امیر نائی، شبّو شہدا، ننّو گورکن، کوڑا بھنگی کہنے کو کمین اور پیشے کے لحاظ سے نیچے تھے۔ مگر ان کی شرافت کا کیا کہنا؟

پھر خدا نے ان کو بڑھایا چڑھایا بھی ایسا ہی تھا۔ میاں مٹھو رہے تو بھٹیارے کے بھٹیارے غریب کو مرتے مرتے گھر کا مکان تک نہ جڑا۔ بھٹیارے سے نان بائی بھی نہ بنے۔ صدا اپنے ہاتھ سے تندور جھونکا۔ ہاں یہ بات ضرور تھی کہ جیتے جی کوئی ان کی طرف انگلی نہ اٹھا سکا کیا مجال جو کسی طور طریق میں بساند آتی۔ نور کے تڑکے سر جھکائے آنا، ہنس کر بات کرنا۔ اپنے کام سے کام رکھنا، اور رات کے بارہ بجے آنکھیں بند کئے چلے جانا۔ آدمی کچھ حسین نہ تھے۔ معمولی قد، چھریرا بدن، سر گھٹا ہوا، چندی آنکھیں پلکیں اڑی ہوئی، شاید دھوئیں اور آگ نے آنکھوں کا یہ درجہ بنا دیا تھا۔ ڈاڑھی کیا بتاؤں، جب کبھی ہوگی تو بالکل خصی بکرے کی سی۔ تندور میں جھک کر روٹی لگائی جاتی ہے۔ کوئی کیسا ہی جھپاکا کرے، آگ کی لپٹ کہاں چھوڑے، جھلستے جھلستے لہسن کی پینڈی بن کر رہ گئی تھی۔ ڈاڑھی کا یہ حال تو مونچھوں کا کیا ذکر۔

دِلّی میں جب تک شاہی رہی دن عید رات شب برات تھی۔ ایک کماتا کنبہ بھر کھاتا۔ نہ ٹیکس تھے، نہ اتنی گرانی، ہر چیز سستی، غدر کے بعد تک روپے کا پچیس سیر آٹا، پکا دو ڈھائی سیر گھی، بکری کا اچھے سے اچھا گوشت چار یا چھ پیسے سیر، ترکاریاں پڑی سڑتیں، کون پوچھتا؟ مکانوں کا کرایہ برائے نام۔ اوّل تو غریب یا امیر سب کے مرنے جینے کے ٹھکانے اپنے الگ۔ پکا محل نہ سہی کچی کھپریل سہی۔ دوسرے غیر جگہ بسے بھی تو مفت برابر۔ آٹھ آنے، روپیہ، دو روپے حد تین، اس سے زیادہ نہ کوئی دیتا نہ لیتا۔ ان فارغ البالیوں اور راحتوں کے بعد مہینے کے تیس دن میں اکتیس میلے کیوں نہ ہوتے؟ ایک نہ ایک تہوار رکھا تھا۔ پھر جو تھا رنگیلا۔ بات بات میں دل کے حوصلے دکھانے اور چھٹی منانے کے بہانے ڈھونڈے جاتے۔ عید کے

پیچھے ہفتہ بھر تک سیریں منائی جاتیں۔ باغوں میں ناچ ہو رہے ہیں۔ دعوتیں اڑ رہی ہیں۔ شب برات آئی آتش بازی بن رہی ہے۔ وزن سے وزن کا مقابلہ ہے۔ بسنتوں کی بہار دیکھنے قابل ہوتی، سورج مکھی کے ارد گرد مرہٹی بازوں کے غول میں واہ واہ کا شور رہے آج اس مزار پر پنکھا چڑھا کل اس درگاہ پر، محرم میں سبیلیں سجتیں۔ تعزیہ داریاں ہوتیں، براق نکلتے، اکھاڑے جمتے۔

"دِلّی کی دل والی منہ چکنا پیٹ خالی"۔ غدر کے بعد کی کہاوت ہے۔ گھر بار لٹ گیا شاہی اجڑ گئی سفید پوشی ہی سفید پوشی باقی تھی۔ اندر خانہ کیا ہوتا ہے؟ کوئی کیا جانے۔ باہر آبرو، جہاں تک سنبھالی جا سکتی سنبھالتے۔ مدتوں پرانی وضعداری کو نبھایا۔ شہر آبادی کی رسمیں پوری کرتے رہے۔ سات دن فاقے کر کے آٹھویں روز پلاؤ کی دیگ ضرور چڑھ جاتی۔ اپنے بس تو باپ دادا کی لکیر چھوڑی نہیں۔ اب زمانہ ہی موافق نہ ہو تو مجبور ہیں۔ فاقے مست کا لقب بھی مسلمانوں کو قلعہ کی تباہی کے بعد ملا ہے۔ اللہ اللہ ایک حکومت نے کیا ساتھ چھوڑا سارے لچھّن جھڑ گئے۔ ہر قدم پر منہ کی کھانے لگے۔

اگلے روپ اب تو کہاں دیکھنے میں آتے ہیں۔ کچھ بدنصیبی نے بگاڑے تو کچھ نئی تہذیب نے بدلے۔ اور جو کہیں دکھائی بھی دیں گے تو بالکل ایسے جیسے کوئی سانگ بھرتا ہے۔ دل کی امنگ کے ساتھ نہیں صرف رسمًا کھیل تماشہ سمجھ کر۔ محرم میں سبیلیں آج بھی رکھی جاتی ہیں۔ تعزیہ داری بھی ہوتی ہے۔ مگر دلوں کے حوصلے مر گئے تو زندگی کس بات میں؟ پرانی روحوں کو ثواب پہنچانے کے سوا کچھ نہیں۔ میاں مٹھّو دکان کے آگے دو کورے مٹکے رکھ کر سبیل بھی لگاتے اور برابر کی دکان میں تعزیہ بھی رکھتے۔

ان کے تعزیہ میں کوئی ندرت تو نہ ہوتی آرائش والوں سے بنوا لیتے۔ معمولی کھپچیوں اور بنّی کا۔ ہاں جو چیز دیکھنے کے قابل تھی وہ ان کی عقیدت یا سوگوار صورت، چاند رات سے جو یہ امام حسین علیہ السلام کے فقیر بنتے تو بارھویں کو حلیم کھا کر کہیں نہاتے دھوتے اور کپڑے بدلتے۔

دلّی میں پچاس ساٹھ برس پہلے "تک منتوں، مرادوں کا بڑا زور تھا، درگاہوں میں چلّے چڑھتے، مسجدوں میں طاق بھرے جاتے، بچوں کے گلے میں اللہ آمین کے گنڈے ڈالتے جینے کے لئے طرح طرح سے منّتیں مانی جاتیں۔ کوئی شاہ مدار کے نام کی چوٹی رکھتا، کوئی حسینی فقیر بناتا۔ لوگ کچھ کہیں جہالت کے عیب لگائیں یا عقیدے کا کچّا بتائیں۔ سچ پوچھو تو فارغ البالی کے سارے چونچلے تھے۔ وہ جو مثل ہے "کیا ننگی نہائے گی کیا نچوڑے گی"، دل ہی افسردہ ہو اور ہاتھ خالی ہو گئے تو جس کام میں جتنی چاہو فی نکال لو، خیر وقت وقت کی راگنیاں ہوتی ہیں۔ مطلب یہ کہ میاں مٹھو بھی فقیر بنتے تھے۔ بچپن میں ماں باپ نے بنایا ہو گا۔ جوانی میں بدصورت یہ بھی کچھ نہ کچھ روپ ہوتا ہے۔ سبز پوشی بھا گئی۔ ہر سال فقیر بننے لگے۔ تعزیہ داری کئی پشتوں سے ان کے ہاں ہوتی آئی تھی۔ یہ اپنے بڑوں کی سُنّت کیوں ترک کرتے۔ اس کے بعد لوگوں کا بیان ہے کہ انہیں کچھ نظر بھی آیا۔ حضرت عباس کی زیارت بھی ہوئی۔ اور ایک مرتبہ نہیں بلکہ کئی بار۔ یہی سبب تھا کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق سچے دل سے تعزیہ نکالتے۔ اور جو کچھ کرتے بناوٹ سے خالی ہوتا۔ جوانی بھر ان کا یہی طور رہا۔ اور مرتے مرتے اور کچھ نہ ہو تعزیہ نکالنا اور فقیر بننا نہ چھوڑا۔ آخر میں غریب کی آنکھیں جاتی رہی تھیں۔ دکان پر ایک شاگرد کو بٹھا دیا تھا۔ وہ نالائق نکلا آٹھ آنے روز استاد کو دیتا وہ

بھی آٹھ آٹھ آنسو رُلا کر۔ تاہم جس طرح بنتا محرم کے لئے انہیں بیس پچیس روپے بچانے لازمی تھے۔ دوستوں کو حلیم کھلا کر فقیری اترتی۔

باپ کے مرنے کے بعد میاں مِٹھو نے جب دوکان سنبھالی ہے تو ان کی عمر پچیس برس سے کم نہ ہو گی۔ شادی ہو گئی تھی بلکہ دو بچے بھی ہو کر مر گئے تھے۔ باپ کے سامنے یہ بھی گھنٹے دو گھنٹے کے لئے تعزیے کے پاس آ کر بیٹھنے لیکن رات کے دس بجے دوکان اٹھا کر۔ اب تعزیہ داری کا بوجھ ان کے سر پر آ پڑا تھا۔ اس لئے چراغ جلتے ہی جلدی جلدی دوکانداری ختم کی، پاس کی مسجد میں نہائے، سبز تہمد باندھا، سبز کرتا پہنا لال کلاوہ گلے میں ڈالا، جھولی سنبھالی، سبز دو پلڑی ٹوپی منڈے ہوئے سر پر جمائی اور تعزیے کے پہلو میں دوزانوں آ بیٹھے۔ ملنے والوں میں جو سوز، نوحہ مرثیہ پڑھنے والے ہوتے آتے اور ثواب کے لئے کچھ پڑھ کر چلے جاتے۔ اب جہاں جہاں اس قسم کی تعزیہ داری ہوتی ہے یہی دیکھنے میں آیا ہے۔ انہیں خود بھی سوز پڑھنے کا شوق تھا شوق کیا، تعزیہ داری، سبیل لگانے حسینی فقیر بننے اور تعزیئے کے آگے کچھ پڑھنے کو نجات کا باعث سمجھتے تھے۔ آواز تو جیسی بھونڈی تھی، تھی ہی۔ طرّہ یہ کہ سلام یا بین جو چیز حضرت پڑھتے وہ بھی سنا گیا آپ ہی تصنیف ہوتی۔ لیکن پڑھتے وقت صورت کچھ ایسی سچ مچ کی رونی بناتے اور ایسے جذبے کے ساتھ ادا کرتے کہ سننے والے حضرت امام کی بے کسی کو بھول کر ان پر ترس کھانے لگتے۔

محلے میں کئی جگہ تعزیے نکلتے اور بڑی کاری گری کے ہوتے۔ مرثیئے بھی وہاں خوب خوب پڑھے جاتے۔ مگر جتنی بھیڑ ان کی دکان کے آگے رہتی۔ کہیں نہ رہتی۔ بڈّھوں کو رقّت چاہیئے اور بچوں کو دل لگی۔ یہ دونوں باتیں میاں مِٹّھو میں موجود تھیں۔ بڑے بوڑھے تو انہیں کچھ اور ہی سمجھنے لگے تھے۔ جاگتے یا سوتے یہ سقائے سکینہ کی زیارت کر چکے تھے۔ سبز عمامہ باندھے نقاب ڈالے نیزہ ہاتھ میں لئے، گھوڑے پر سوار

سیّد الشہدا ، حضرت امام حسین کو بھی انہوں نے اپنے تعزیے کے سامنے دیکھا تھا۔ یہ اپنا گھڑا ہوا سلام الاپتے اور وہ بیٹھے سر دھنا کرتے۔ لڑکے بالے کچھ تو ریوڑیوں یا کھیلوں کے لالچ میں جمے رہتے یا ان حرکات و سکنات کا تماشا دیکھنے کے لئے۔ بے چارے شاعر تو کیا تھے بلکہ کلام مجید بھی پورا نہیں پڑھا تھا۔ جوانی میں جاوڑی بازار بھی دو چار ہی مرتبہ گئے ہوں گے۔ ورنہ مرثیے کے دو چار بند، سلام کے پانچ سات شعر یا کوئی سوز وہیں سے یاد کر لاتے۔ اب شوق پورا کرنا ٹھیرا، گھڑ گھڑا کر ایک سلام بنا لیا، میرا حافظہ کم بخت ایسا ہے کہ کئی دفعہ سُنا اور یاد نہیں رہا۔ حالانکہ میاں مٹھّو اسی سلام کی بدولت بنے۔ سلام کہو یا مرثیہ، سوز کہو یا نوحہ کوئی ایسی چیز تھی جس میں بار بار ؎

"نبی جی کے لاڈلوں پہ بھیجو سلام"

آتا تھا۔ اور اسی کو وہ سب سے زیادہ لہک لہک کر ادا کرتے تھے۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ ناپ تول کے حساب سے کوئی مصرعہ ہے یا کیا۔ افسوس میں نے لکھ کیوں نہ لیا۔ اور اب جس سے پوچھتا ہوں اسی ایک مصرعہ کے سوا کچھ نہیں بتاتا۔ اچھّا اس مصرعے سے اور میاں مٹھّو کے خطاب سے کیا نسبت؟ آہ دِلّی مرحوم! دِلّی والوں کی دور بلا، میاں دِلّی والے ہی نہ رہے۔ دِلّی کا چھ برس کا بچہ تک سمجھ جاتا۔ آخر کریم بخش یا رحیم بخش پر میاں مٹھّو کی پھبتی بھی تو بچّوں ہی نے کہی تھی۔ "نبی جی کے لاڈلوں پر سلام" والا سلام پڑھتے انہیں دوسرا دن تھا کہ محلّے کا ایک لڑکا روٹی پکوانے آیا۔ اتفاق سے رات کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ لڑکا انہیں دیکھتا اور مسکراتا رہا۔ اکیلا تھا کچھ کہنے کا حیاؤ نہ پڑا۔ اتنے میں اس کا ایک یار بھی آ پہنچا۔ ایک نے دوسرے کو دیکھا۔ میاں مٹھّو کی طرف اشارہ کیا اور دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ ہنستے ہنستے ایک بولا "میاں مٹھّو ہیں"، دوسرا کہنے لگا "میاں مٹھو نبی جی بھیجو" دوکان پر

کھڑے ہونے والے لونڈوں کی باتوں پر لوٹ لوٹ گئے۔ اب کیا تھا۔ ساری گلی میں "میاں مٹھو نبی جی بھیجو" شروع ہو گیا۔ اس دن سے یہ ایسے میاں مٹھو بنے کہ لوگوں کو ان کا اصلی نام ہی یاد نہ رہا۔ لیکن اللہ بخشے کبھی برا نہ مانا اور نہ اپنی وضع بدلی۔ مرتے مرتے اپنا وہی سلام پڑھا۔

اشرف صبوحی دہلوی
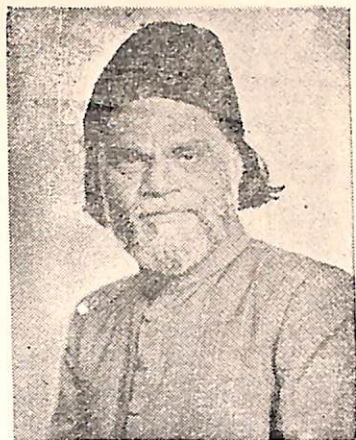
جگر مرادآبادی
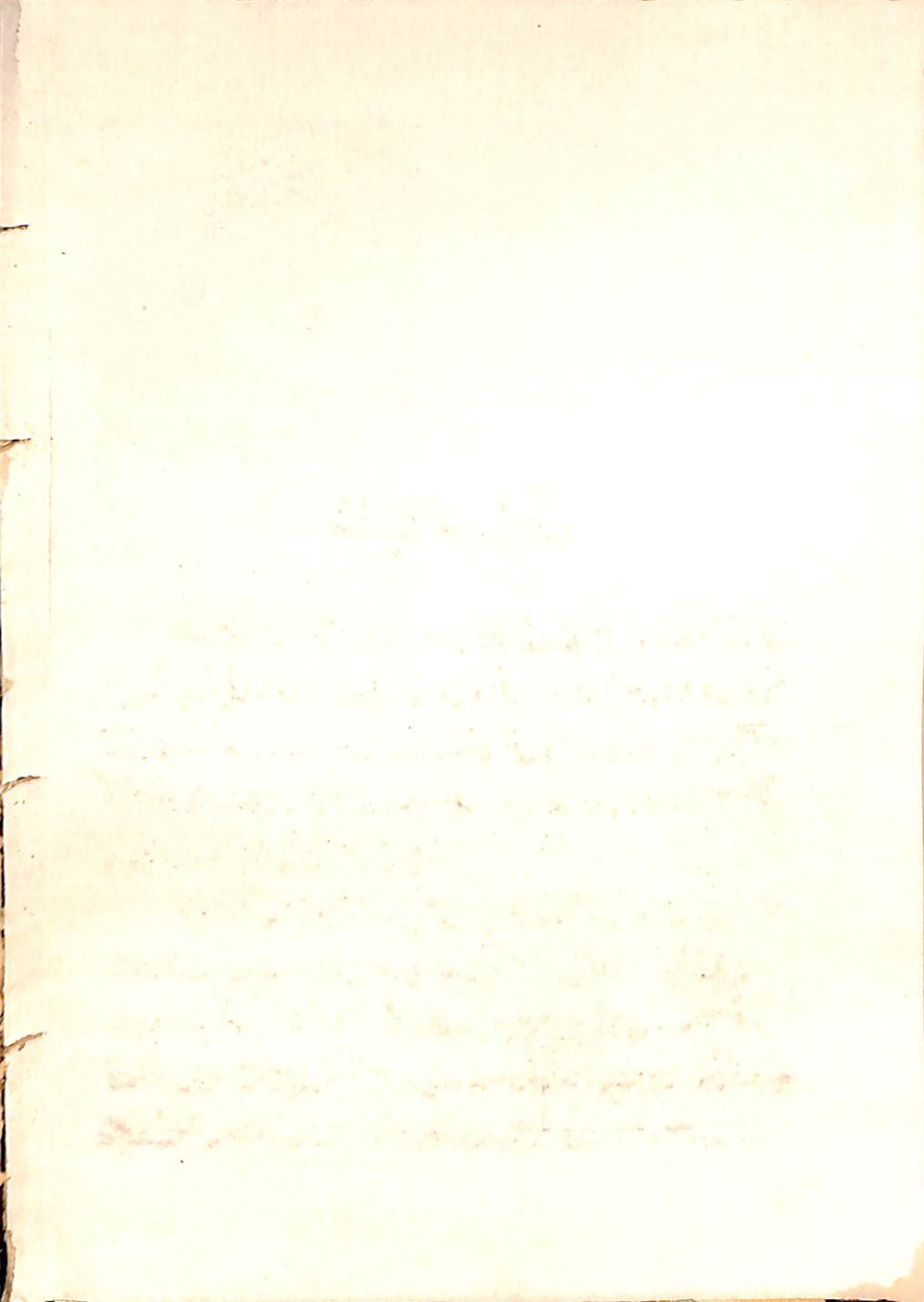
شاہد احمد دہلوی

شاہد احمد دہلوی

شاہد احمد دہلوی کا نام اردو داں طبقے کے لئے کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے اور "ساقی" کے ایڈیٹر ہیں اور ان دونوں حیثیتوں سے انہوں نے اردو زبان وادب کی بیش بہا خدمت کی ہے۔ اپنی پرخلوص کوششوں اور خداداد صلاحیتوں سے شاہد صاحب نے اردو صحافت کو اس مقام پر پہنچا دیا جو غالباً اس فن کی معراج ہے۔

شاہد صاحب ۲۲ مئی ۱۹۰۶ء کو دہلی میں پیدا ہوئے، آپ کو زبان اپنے بزرگوں سے ورثہ میں ملی ہے وہ اعلیٰ درجہ کی شستہ شگفتہ اور بامحاورہ نثر لکھتے ہیں۔ شاہد صاحب کو دِلّی کے مظلوم کاریگر طبقے سے بھی غیر معمولی دلچسپی ہے۔ وہ انگریزی زدہ لوگوں کی طرح انہیں بنظرِ کم نہیں دیکھتے بلکہ ان کی معاشرت اور زندگی کے پاکیزہ پہلوؤں کا بغور مطالعہ کرتے ہیں، انہیں خاکوں، انشائیوں اور مضامین میں پیش

کرنے میں۔ ان کی غیر معمولی قوت مشاہدہ اور زورِ قلم نے ان کے مضامین اور خصوصًا خاکوں میں بڑی جان ڈال دی ہے۔ آپ کو دِلّی کی ٹکسالی زبان پر وہی قدرت حاصل ہے جو آغا حیدر حسن، خواجہ محمد شفیع اور اشرف صبوحی کو ہے لیکن انگریزی ادب کے وسیع مطالعہ نے شاہد صاحب کے قلم میں کچھ اور ہی نکھار پیدا کر دیا ہے۔
آپ آجکل کراچی میں مقیم ہیں۔

جگر مرادآبادی

بعض چہرے بڑے دھوکہ باز ہوتے ہیں

کالا گھٹا ہوا رنگ، اس میں سفید سفید کوڑیوں کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں، سر پر اُلجھے ہوئے پٹھے، گول چہرہ، چہرہ کے رقبے کے مقابلے میں ناک کسی قدر چھوٹی اور منہ کسی قدر بڑا۔ کثرتِ پان خوری کے باعث منہ اگالدان، دانت شریفے کے بیج اور لب کلیجی کی دو بوٹیاں۔ بھرواں کالی ڈاڑھی، ایڈورڈ فیشن کی، سر پر ترکی ٹوپی بر میں اچکن، آڑا پاجامہ نیم ساق تک چوڑیاں پڑی ہوئیں۔ پاؤں میں پیٹنٹ کی گرگابی، بائیں ہاتھ میں ایک میانہ قد و قامت کا اٹیچی کیس۔ کوئی بتیس ۳۲ سال ادھر کا ذکر ہے جھانسی میں ایک صاحب سر جھکائے قدم بڑھائے اپنے دھن میں جھومتے چلے جا رہے تھے۔ میرے میزبان نے بتایا "یہ ہیں جگر صاحب"۔ میں نے سُنی اَن سُنی کر دی۔ ہوں گے کوئی۔ میں نے کبھی ان کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ میرے میزبان نے کہا "آج رات مشاعرہ ہے۔ آپ کو لے چلیں گے"۔ میں نے کہا "کسی اور بڑے کام میں وقت کیوں نہ ضائع کیا جائے؟ کوئی گویّا ہو تو اس کا گانا سُنا جائے"۔ وکیل صاحب نے کہا "اس کا بھی انتظام کیا ہے ہم نے، کل ہم آپ کو یہاں کے

ایک استاد کا گانا سنوائیں گے۔ مگر آج مشاعرے میں ضرور چلئے۔ جگر صاحب کا کلام آپ نے غالباً سنا نہیں ہے۔ سننے کے لائق ہے۔" میں نے جی میں کہا "لو بھئی آج رات تو غارت ہوئی، "قہرِ درویش برجانِ درویش"۔ میزبان کی خواہش کا احترام بھی ضروری تھا طوعاً و کرہاً رات کو مشاعرے میں چلنے کی حامی بھر لی۔"

پنڈال کشادہ بنایا گیا تھا اور روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ اگلی صفوں میں ہمیں جگہ دی گئی مشاعرہ شروع ہونے میں کچھ دیر تھی۔ وکیل صاحب سے باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ جھانسی میں آئے دن مشاعرے ہوتے رہتے ہیں اور ان مشاعروں کی جان جگر صاحب ہوتے ہیں۔ ہر پھر کے جگر صاحب ہی کی تعریف ہوئے جا رہی تھی۔ میں نے وکیل صاحب سے کہا "یہ تو بتائیے کہ جگر صاحب کون ہیں اور کیا ہیں؟" انھوں نے مجھے ایسی استعجابی نظروں سے دیکھا جیسے میں نے کوئی نہایت احمقانہ بات کہدی ہو۔ بولے "بہت اچھے شاعر ہیں۔ عینکوں کے ایجنٹ ہیں۔" میں نے کہا "اوہو! عینکیں بیچتے ہیں تو یقیناً بہت اچھے شاعر ہوں گے۔" وکیل صاحب کے چہرے پر خفّت کے آثار نمودار ہوئے اور کسی قدر ناگواری کے بھی۔ میں نے اس "تکدّر" کو ٹالنے کے لئے کہا "اندھوں کو آنکھیں دیتے ہیں اور کیا چاہئے۔" وکیل صاحب ہنسنے لگے۔

شعراء کی آمد ہوئی۔ مشاعرے کے کارکنوں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور ڈائس پر پہنچا دیا۔ تھوڑی دیر میں جنابِ صدر بھی تشریف لے آئے۔ ضلع کے حاکم تھے ان کے مسندِ صدارت سنبھالتے ہی مشاعرہ شروع ہو گیا۔ پہلے چھٹ بھیّوں نے لہک لہک کر اپنا کلام سنایا۔ پھر بیچ کی راس کے شاعروں نے۔ ان کے بعد جغادریوں نے۔ اتنے میں شور برپا ہوا۔ "آ گئے جگر صاحب آ گئے"، انھیں ڈائس پر پہنچایا گیا اور وہ سلام کر کے جنابِ صدر کے پہلو

میں جا بیٹھے۔ پڑھنے والوں کے چہرے اتر گئے اب جو پڑھنے آتا۔ گھبرایا بولایا آتا اور گھاس سی کاٹ کر چل دیتا جب سب پڑھ چکے تو جنابِ صدر نے جگرؔ صاحب سے درخواست کی اور سارا پنڈال تالیوں سے گونج گیا جگرؔ صاحب خندۂ دنداں نما کرتے آگے بڑھ آئے وکیل صاحب نے زیرِ لب فرمایا "اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی"۔ میں نے پوچھا "یہ آپ مجھ سے فرما رہے ہیں یا جگرؔ صاحب سے؟" وکیل صاحب کھسیانی ہنسی ہنس کر رہ گئے۔ جگرؔ صاحب نے گنگنا کر سُر قائم کیا اور اپنے مخصوص ترنّم میں غزل سُنانی شروع کی۔ مطلع سے مقطع تک غزل کا انداز ہی نیا تھا اس پر خوش گلوئی! پنڈال اٹھا کر رکھ دیا۔ کئی کئی دفعہ ایک ایک شعر کو پڑھوایا گیا۔ میں نے جگرؔ سے پہلے اتنا سریلا شاعر اور کوئی نہیں سُنا۔ یا پھر گانے والے شاعر سنے تھے جو باقاعدہ تان پلٹے کرتے تھے مثلاً حفیظؔ، ساغرؔ، روشؔ صدیقی وغیرہ۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ جگرؔ صاحب کا پڑھنا ترنّم ہی رہتا تھا۔ گانا نہیں بنتا تھا جگرؔ صاحب کو اس مشاعرے میں سنکر میں بھی ان کے مدّاحوں میں شامل ہو گیا

خاکساران جہاں را بہ حقارت منگر
تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

میں ۱۹۳۱ء یا ۳۲ء میں حیدرآباد گیا تھا واپسی میں دو دن کے لئے سیّد ابو محمد مرحوم کے ہاں بھوپال ٹھہرا تھا۔ سیّد صاحب بڑی خوبیوں کے آدمی تھے آپ انھیں یوں پہچانئے کہ سید ابو الاعلیٰ مودودی کے بڑے بھائی تھے۔ جگرؔ صاحب اس زمانے میں بھوپال ہی میں تھے۔ خبر نہیں کہاں سے انہیں معلوم ہوا تیسرے پہر مجھ سے ملنے چلے آئے ان سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ بڑے خلوص و محبّت سے گلے ملے۔ میری خیریت پوچھی۔ "ساقی" کی کیفیت دریافت کی۔ خود ہی "ساقی" کے لئے اپنا

کلام بھیجنے کا وعدہ کیا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اپنی ایک غزل لکھ کر دی۔ بڑے خوش خط تھے جگر صاحب جو انداز پرانے زمانے کی وصلیوں کا ہوتا ہے اسی انداز میں یہ غزل قلم برداشتہ لکھی تھی۔ مگر موتی جڑ دیئے تھے۔ اختتام پر اپنے نام کا طغرا بنا دیا تھا۔ مزاج کی نفاست زبانِ قلم سے ٹپکتی تھی کتنی خوبصورتی چھپی ہوئی تھی۔ اس ظاہرہ بدشکل انسان کے اندر! میری فرمائش پر غزل پڑھ کر بھی سنائی۔ نور کا گلا پایا تھا۔ اندھیرے میں روشنی پھوٹ رہی تھی کیا آبِ حیواں کی طرح دنیا کی تمام بیش قیمت اور حسین چیزیں تاریکی ہی میں ہیں؟

میرے ہاں دلّی کے آخری نرت کار استاد اللہ دیئے خاں آیا کرتے تھے۔ عمر ستّر سے اوپر ہی تھی۔ سوکھ کر چمرخ ہو گئے تھے۔ دانت ٹوٹے ہوئے گال پچکے ہوئے بڑی بڑی سفید گھنی مونچھیں، داڑھی منڈھی ہوئی مگر بقول مرزا چپونٹیوں کے انڈے موجود رہتے۔ بصورتِ موجودہ کوئی استاد کو اپنے پاس بٹھانے تک کا روادار نہ ہوتا مگر جب وہ ٹھمری یا دادرے کا کوئی بول لگا کر بتانا شروع کرتے تو یہ معلوم ہوتا کہ اندر کے اکھاڑے کی کوئی اپسرا اتر آئی ہے۔ اسی کریہہ منظر بوڑھے استاد کو گلے لگا لینے کو جی چاہنے لگتا۔ شاید فنکار کا فن ہمیشہ جوان و حسین رہتا ہے اور اس کی خوبصورت روح اس کے بدصورت جسم کی پردہ پوش ہو جاتی ہے۔ جگر صاحب بھی جب اپنا کلام سناتے تو حسین نظر آنے لگتے۔

بھوپال کی مختصر ملاقات کے بعد جگر صاحب سے اکثر ملنا ہوتا رہا۔ ان مختصر ملاقاتوں میں کبھی کبھی شعر و شاعری پر بھی بات نکل چلتی تو جگر صاحب کیٹس اور شیلے تک کے نام لے جاتے۔ باتیں خاصی معقول کرتے تھے اوچھے پن کی حرکتیں نہیں کرتے

تھے اور نہ ضرورت سے زیادہ بے تکلّف ہوتے تھے۔ ان کے مزاج کی شائستگی اُن کی غزل میں ڈھل گئی تھی۔ ان سے کبھی کسی کی برائی نہیں سنی اور نہ کبھی یہ سنا کہ کسی کو دھوکہ دیا، یا کوئی بیہودہ بات کی۔ وہ صحیح معنوں میں ایک شریف النفس انسان تھے۔ کارڈینل نیومن نے جنٹل مین Gentle man کی تعریف یوں کی ہے کہ وہ کسی کو دکھ نہیں پہنچاتا۔ جگؔر صاحب ایک Perfect Gentle man تھے۔

نیاز فتحپوری Stunts کے قائل ہیں۔ وہ ہمیشہ چونکانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً آپ کہیں گے کہ جنّت اور دوزخ ہے تو وہ کہیں گے نہیں ہے آپ کہیں گے خدا ہے تو وہ کہیں گے نہیں ہے۔ آپ کہیں گے قرآن شریف کلام اللہ ہے تو کہیں گے کلامِ رسول ہے آپ کہیں گے یہ دن ہے تو وہ کہیں گے نہیں رات ہے۔ برنارڈ شاہ کے ایک کردار کی طرح اختلاف ضرور کریں گے۔ اس نے کہا "بیٹھ جاؤ"، تو بولا "نہیں میں کھڑا رہوں گا" کہا "اچھا تو کھڑے رہو"، "نہیں میں بیٹھوں گا"، یہ کہہ کر بیٹھ گیا۔ تو اسی سے ملتی جلتی فطرت نیاز صاحب کی ہے۔ حال ہی میں انھوں نے "نگار" کا "جگر نمبر" شائع کیا ہے۔ جگؔر کے انتقال پر ہندوستان اور پاکستان میں بہت سوگ منایا گیا اور رسالوں نے جگؔر نمبر شائع کئے۔ نیاز صاحب بھلا ٹھنڈے پیٹوں تعریف و توصیف کے اس پشتارے کو کیسے گوارا کر لیتے؟ چنانچہ انھوں نے بھی ایک "جگر نمبر" شائع کر دیا جس میں سوائے جگؔر کی بُرائی کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس نمبر کا حشر تو وہی ہوگا جو آسمان پر تھوکنے کا۔ مجھے یہاں ایک واقعہ کی وضاحت کرنی ہے جو اس نمبر میں درج کیا گیا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا کراچی میں ایک مشاعرہ ہوا تھا جس کی صدارت کے لئے جناب نیاز کو لکھنؤ سے بلوایا گیا تھا۔ کس نے بلایا اور کیوں بلوایا تھا اس کو اس وقت چھوڑیئے۔ نیاز

صاحب نے لکھا ہے کہ انھیں کراچی پہنچ کر معلوم ہوا کہ جگرؔ صاحب کراچی میں موجود ہیں۔ مگر انھوں نے نیاز صاحب کی صدارت میں پڑھنے سے انکار کر دیا۔ نیاز صاحب نے جگرؔ کے انکار کی وجہ ان کی تنقیدوں کو قرار دیا جو کبھی "نگار" میں انھوں نے کلام جگرؔ پر لکھی تھیں۔ مگر ہوا یہ جگرؔ صاحب مشاعرے میں آئے اور انھوں نے کلام بھی سنایا۔ اس واقعہ کو لکھ کر نیاز صاحب نے فرمایا ہے کہ جگرؔ چونکہ پیسے لیکر پڑھتے تھے اس لئے وہ مشاعرے میں شرکت پر مجبور تھے۔ پھر اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ پیسے لیکر پڑھنے والے شاعر کا کلام پھُسپھسا ہوتا ہے اسی مفروضہ پر نیاز صاحب نے اپنی جانب میں اس خاص نمبر میں کلام جگرؔ کے بخیئے اُدھیڑ دیئے ہیں مگر جب آپ ان کے اعتراضات پڑھیں گے تو آپ کو اس بوڑھے علامہ کے بچکانہ اعتراضات پر ہنسی آنے لگے گی۔ خیر، یہ ایک الگ لغویت ہے جس سے محظوظ ہونے کے لئے اگر آپ وقت نکال سکتے ہوں تو نکال لیجئے ہمیں تو صرف اس مشاعرے والے واقعہ سے سروکار ہے۔ جگرؔ اتنے چھوٹے دل کے آدمی نہیں تھے کہ نیاز صاحب کی تنقید سے چراغ پا ہو جاتے اور سالہا سال تک ان سے دل میں بُغض رکھتے۔ جگرؔ صاحب کا ساری عمر یہ عمل رہا کہ اپنے بدخواہوں کو معاف کر دیتے تھے۔ اُن کے نزدیک یہی سب سے بڑی سزا تھی۔ اس کے علاوہ اخلاقی اعتبار سے جگرؔ صاحب اتنے گرے ہوئے بھی نہیں تھے کہ کراچی کا مشاعرہ نہ پڑھتے تو ان کے ہاں فاقے پڑ جاتے۔ جگرؔ صاحب کراچی آ کر مہینوں رہتے تھے اور بغیر مشاعروں کے بھی رئیسوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ میں نے انھیں بیسیوں جگہ مفت پڑھتے سنا ہے۔ اس مشاعرے میں بھی وہ نیاز صاحب کی طرح پورا خرچہ لیکر ہندوستان سے کراچی نہیں آئے تھے بلکہ یہاں پہلے سے موجود تھے۔ اور ان کا مشاعرے میں شریک ہو جانا ہی نیاز صاحب کے بہتان کی تردید کے لئے کافی ہے جگرؔ صاحب

ایک شریف النفس انسان تھے اور جہاں تک ممکن ہوتا کسی کو دُکھ نہیں پہنچاتے تھے۔
جگرؔ صاحب ایک سیر چشم آدمی تھے روپیہ پیسہ ان کے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتا تھا میں
نے ان کا وہ زمانہ دیکھا ہے جب وہ شراب کے نشے میں دھت رہا کرتے تھے اور کوڑی
کوڑی کو محتاج مگر میں نے آج تک کسی سے نہیں سنا کہ جگرؔ نے کسی کے آگے ہاتھ پھیلایا
ہو۔ مدہوشی میں بھی انھوں نے اپنی غیرت و خودداری کو ہاتھ سے نہیں دیا۔
نخشبؔ جارچوی نے جگرؔ صاحب کا ایک واقعہ سنایا تھا کہ کسی فلم کے لئے جگرؔ صاحب
کی ایک غزل ریکارڈ کرنی تھی۔ جگرؔ صاحب کو اس کا معاوضہ ٹھیک یاد نہیں رہا، پانچ ہزار
یا آٹھ ہزار پیشگی دیدیا گیا۔ جگرؔ صاحب اس سے پہلے ریڈیو کے مختلف اسٹیشنوں سے
اپنا کلام نشر بھی کرچکے تھے اور ریکارڈ بھی کراچکے تھے۔ لہٰذا نہایت اطمینان سے فلم کے
لئے بھی اپنی ریکارڈنگ کرانے کیلئے بیٹھ گئے۔ مگر جب اپنا ریکارڈ خود سنا تو سٹ پٹا گئے
اور اسے ناپسند کرکے دوبارہ ریکارڈ کیا۔ مگر اس دفعہ بھی انہیں اپنا ریکارڈ نہایت
بے سرا معلوم ہوا تیسری دفعہ اور چوتھی دفعہ بھی ناکام رہے۔ غرض چھ دفعہ یہی ماجرا پیش آیا۔
سخت بددل ہوئے کمپنی والوں نے کہا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں آپ اب کل پھر
تشریف لائیے، گھر پہنچ کر نخشبؔ سے بولے "خدا جانے کیا بات ہے کہ ریکارڈ اچھا
نہیں بن رہا۔ تم ایسا کرو کہ یہ روپیہ واپس کردو اور مجھے آج سوار کرادو" نخشبؔ صاحب
نے انہیں تسلی دی اور ایک دن کے لئے اور انھیں روکنے میں کامیاب ہوگئے۔ اگلے
دن بھی ریکارڈ لئے مگر سب ناقص رہے جگرؔ صاحب کی پریشانی اور شرمندگی بڑھتی جارہی
تھی اور ریکارڈنگ بد سے بدتر ہوئی جارہی تھی۔ نخشبؔ صاحب کو ایک ترکیب سوجھی
مائیکروفون ان کے سامنے سے ہٹا دیا اور بولے "کچھ دیر تو توقف کیجئے چائے وائے

پیجئے پھر دیکھا جائے گا" جگر صاحب نے جھنجلا کر کہا "میاں تم ان کا روپیہ واپس کر دو اور مجھے گھر جانے دو" انھوں نے کہا "بہت اچھا روپیہ واپس کر دیا جائے گا مگر آپ اطمینان سے بیٹھ کر چائے تو پی لیجئے" جگر صاحب خوش ہو گئے جیسے منوں بوجھ ان کے سر سے اتر گیا ہو۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہنس ہنس کر کرنے لگے۔ چائے پی چکے تو نخشب نے کہا۔ "در اصل آپ کو مائیکروفون کا احساس ہو جاتا ہے۔ اب اگر آپ پڑھیں گے تو بالکل ٹھیک پڑھیں گے ذرا پڑھیئے تو" جگر صاحب پڑھنے لگے، جب پڑھ چکے تو اسی کا ریکارڈ انھیں سنایا گیا۔ حیران ہو کر بولے "یہ کونسا ریکارڈ ہے؟ یہ تو ٹھیک ہے" نخشب نے بتایا کہ "ابھی جو آپ پڑھ رہے تھے اس کا ریکارڈ ہے" "مگر کب اور کیسے ریکارڈ کر لیا؟" "جی یہ ہمارے TRICK OF THE TRADE ہیں اب گھر چلیئے روپیہ واپس کرنے کی ضرورت نہیں رہی"

جس شخص کا یہ کردار ہو وہ پیسے کا میت کیسے ہو سکتا ہے۔ جب وہ پانچ ہزار سے دست کش ہو سکتا ہے تو کیا پانچسو کے مشاعرے کو نہیں چھوڑ سکتا؟ وہ مشاعرے میں روپے کے لئے نہیں بلکہ اس لئے شریک ہوئے کہ ان کی عدم شرکت سے مشاعرے کے کارکنوں کے ساتھ سامعین کی بھی دل آزاری ہوتی اور خود جناب نیاز صاحب کو خفت اٹھانی پڑتی۔ جگر صاحب کو جو بے پناہ مقبولیت حاصل تھی وہ کسی نے ہاتھ اٹھا کر خیرات میں انھیں نہیں دی تھی۔ ادب دوستوں نے انھیں رئیس المتغزلین قرار دیا تھا۔ اگر انہیں شہنشاہ تغزل کہا گیا (یہ نیاز صاحب ہی کا بیان ہے) تو شہنشاہیت کا تاج بھی خاصانِ ادب ہی نے ان کے سر پہ رکھا ہو گا۔ خدا کا شکر ہے کہ جگر صاحب محسود تھے۔ حاسد نہیں تھے۔ شریف آدمی حاسد نہیں ہوتے۔

جگر صاحب "شعلہ طور" کی اشاعت سے پہلے بھی شاعر تھے اور ان کا ایک مجموعہ کلام شائع ہوکر گمنام ہوچکا تھا۔ اس زمانے کے کلام میں بھی ایک تیکھا پن تھا مگر سُنا ہے کہ معرکہ عشق میں ناکام ہونے کے بعد ان کے ساتھ ان کے کلام کی بھی دنیا بدل گئی جگر کی غزل میں جو نیا مزاج پایا جاتا ہے وہ اسی محرومی کا نتیجہ ہے۔ عشق کی آگ بھڑک کر شعلہ طور بن گئی۔ "شعلہ طور" کا پہلا ایڈیشن چھپتے ہی ختم ہوگیا۔ سید سلیمان ندوی مرحوم نے شاعر اور کلامِ شاعر کا تعارف کرایا تھا۔ میرے پاس جب یہ نسخہ ریویو کے لئے آیا تو میں نے اور انصار ناصری نے جگر ہی کی دھنوں میں لہک لہک کر پوری ایک رات اسے ختم کرنے میں صرف کردی تھی۔ اس ایڈیشن میں ادیا ما کا بنایا ہوا جگر کا ایک پنسل اسکیچ بھی تھا جو اس قدر اعلیٰ درجہ کا تھا کہ ہم اسے غیر ملکی آرٹسٹ کا کارنامہ سمجھتے رہے۔ بعد میں جامعہ ملیہ میں ادیاما سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ ہمارے ہی ملک کا ایک دھان پان سا نوجوان ہے جس کے دل میں آگ بھری ہوئی ہے دو چار دفعہ کی ملاقات کے بعد جب اس سے پوچھا کہ یہ آپ نے اپنا نام کیا رکھا ہے تو اس نے بتایا کہ ادیاما جاپانی زبان میں جوالامکھی کو کہتے ہیں پر اسرار سا آدمی تھا۔ دلّی سے غائب ہوگیا۔ پھر سنا کہ مر گیا۔

جگر صاحب ایک زمانے میں مچھلی کی طرح شراب پیتے تھے ان کے قدردانوں نے یہ وطیرہ اختیار کر لیا تھا کہ جب اُن کا کلام سُننا ہوتا تو ان کے لئے ایک بوتل منگا لیتے سوکھے دھانوں میں پانی پڑجاتا۔ گھنٹوں اپنا کلام سناتے رہتے۔ پھر ان کا لپکا اتنا زیادہ ہوگیا کہ ہر وقت پینے لگے۔ جگر صاحب کی زندگی کا یہ دور ثقہ حضرات کے نزدیک خاصہ قابلِ اعتراض تھا۔ مگر مدہوشی کا یہی دور ان کی شاعری کے عروج کا دور تھا۔ ان کے قدردان اور مشاعرے والے جامِ مے کی مانند انھیں ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ روپیہ

اُن پر برستا تھا مگر وہ کل کے لئے آج شراب میں خست نہیں کرتے تھے۔ روپیہ
اِدھر آیا اور اُدھر شراب بن کر اڑا۔ خبر نہیں گھر کی زندگی اس شراب نوشی کی وجہ سے
اجڑی یا گھر کی اجڑی ہوئی زندگی نے کثرتِ مے نوشی کے پر لگائے۔ دنوں مہینوں گھر
کا رُخ نہ کرتے۔ آج اس کے یہاں ٹھہرے ہیں کل اس کے ہاں۔ اصغر گونڈوی ان کے
بڑے ہم زلف تھے۔ جب انھوں نے میاں بیوی میں نااتفاقی کی یہ صورت دیکھی تو جگرؔ سے
کہا کہ اپنے ساتھ بیوی کی زندگی کیوں خراب کر رہے ہو۔ طلاق دیدو۔ اصغر کا جگرؔ صاحب
بہت ادب کرتے تھے۔ تعمیلِ ارشاد میں طلاق دیدی۔ شراب اور بڑھ گئی۔ اتنی کہ مشاعروں
کے اسٹیج پر بوتل اور گلاس ساتھ رہنے لگا۔ غزل پڑھتے پڑھتے بھول جاتے اور سامعین
خاصے بے لطف ہوتے مگر اُن کے کلام اور ان کے کمال کی وجہ سے اُن کی اس لغویت کو
نظر انداز کر دیتے کچھ رسم ایسی پڑ گئی تھی کہ بغیر جگرؔ کے کوئی مشاعرہ کامیاب نہیں ہوتا تھا
میں نے بہت سے ذہین شاعروں کو شراب سے تباہ و برباد ہوتے دیکھا ہے۔ اخترؔ
شیرانی، میراں جی، اور مجازؔ کا تو آخر میں یہ حال ہو گیا تھا کہ اسٹیج پر نہ صرف قے کر دیتے
تھے بلکہ پیشاب بھی کر دیتے تھے اور لوگ اٹھا کر ان کے ٹھکانوں پر پہنچایا کرتے تھے۔
جگرؔ صاحب اتنے نہیں گرے تھے انھیں پھر بھی ہوش رہتا تھا اور ان کی طرح اَول نول
بکنے نہیں لگتے تھے۔ ان لوگوں میں اور بہت سی اخلاقی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں جن
کی وجہ سے لوگ ان سے بھاگنے لگے تھے۔ جگرؔ صاحب نے کسی کی بہو بیٹی کو نہیں تاکا۔ کسی
سے بھیک نہیں مانگی۔ تانگے والوں اور چھکڑے والوں سے انہیں لڑتے ہوئے نہیں دیکھا
اور پٹتے ہوتے بھی کبھی نہیں پائے گئے۔ ان کی شراب خوری کے نقصانات ان ہی کی
ذات تک محدود تھے۔ دوسروں کو ان کا خمیازہ بھگتنا نہیں پڑتا تھا۔ اوروں کی شاعری

دم توڑتی چلی گئی۔ جگر کی شاعری توانا سے توانا تر ہوتی چلی گئی۔ اپنے اپنے ظرف کی بات ہے جگر کی شرافتِ نفس میں فرق نہیں آیا اور اسی وجہ سے ان کی نفاستِ شاعری بھی قائم رہی۔

اصغر صاحب کی بیوی کا جب انتقال ہوگیا تو انھوں نے اپنی سالی یعنی جگر کی مطلقہ سے شادی کرلی۔ یوں دو اجڑے گھر بس گئے۔ جگر صاحب نے اس نئے رشتے پر برہمی کا مطلق اظہار نہیں کیا۔ بلکہ اصغر صاحب سے اُن کی محبت اور عقیدت کچھ بڑھ ہی گئی۔ یار لوگوں نے اس واقعہ کے افسانے تراش لئے مگر حقیقت یہ ہے کہ جگر صاحب نے اصغر صاحب کے ساتھ ان کی بیوی کی عزت و تکریم بھی شروع کردی۔ وہی ناپسندیدہ بیوی اب اُن کے لئے ایک لائقِ احترام خاتون بن گئی تھیں۔ اسی سے اندازہ لگایئے کہ جگر صاحب حفظِ مراتب کا کس قدر خیال رکھتے تھے۔

گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی

کچھ عرصہ بعد اصغر گونڈوی کا انتقال ہوگیا۔ جگر صاحب کو بڑا رنج پہنچا۔ ان کی زندگی میں یہ ایک زبردست انقلابی نقطہ تھا سُنا کہ جگر صاحب بہت بیمار ہیں۔ اتنے کہ مشاعروں میں شرکت کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ اُن کی بیماری تھی ترکِ شراب۔ سنا تھا کہ یہ منہ سے لگ جائے تو پھر نہیں چھوٹتی۔ مگر جگر صاحب نے یک لخت شراب چھوڑ دی۔ ان کے دِل کی حالت بگڑ گئی۔ طبیبوں نے کہا رفتہ رفتہ کم کرکے چھوڑو ورنہ مرجاؤ گے۔ مگر جگر صاحب بڑے مضبوط کردار کے آدمی تھے انھوں نے کہا "جب چھوڑنی ہی ٹھہری تو بس چھوڑ دی اب جان جائے یا رہے" اس کا ردِّ عمل اتنا شدید ہوا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ جگر صاحب نے اپنے آپ کو اتنی سخت آزمائش میں آخر کیوں مبتلا کیا؟ معلوم ہوا کہ یہ بھی محبت کی کارفرمائی ہے۔ اصغر صاحب کے انتقال کے بعد جگر صاحب کو ان

کی بیوی اور اپنی سابقہ بیوی سے محبت ہو گئی۔ عدّت پوری ہونے کے بعد حرفِ مطلب زبان پر لائے۔ انہوں نے فرمایا "شراب چھوڑ دو" اس اللہ کے بندے نے شراب چھوڑ دی۔ بڑی بُری بُری حالتیں ہوئیں۔ مگر نیت نیک تھی۔ ساحلِ مراد پر زندہ ہی پہنچ گئے۔ انھوں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ شادی کے بعد جگؔر صاحب نے ایک نئی زندگی کا آغاز کیا۔ رندی و سرمستی رخصت ہو چکی تھی۔ اب وہ ایک زاہدِ خشک بن گئے تھے مگر اس زہد و اتقا میں اُن کا دلِ زندہ مرنے نہیں پایا تھا۔ طبیعت کی مستقل خرابی کے باوجود خوب ہنستے بولتے تھے۔ گھنٹوں برج کھیلا کرتے تھے۔ مشاعروں اور ادبی محفلوں اور دوستوں کے ہاں آیا جایا کرتے تھے۔ اخلاق اور بھی نکھر گیا تھا۔ کھانا وہ پہلے بھی کم کھاتے تھے اب تو لوں ماشوں پر آ گیا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان میں یکساں عزّت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ بیوی سلیقہ مند خاتون تھیں۔ چند سال کے پھیر میں ہی مشاعروں کے روپے سے سنا ہے کہ انھوں نے جگؔر صاحب کو صاحبِ جائداد بنا دیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد جگؔر صاحب نے یو۔ پی کے مسلمانوں کے لئے بہت مفید کام کئے۔ حکّام ان کی عزّت کرتے تھے اور ان کی بات نہیں ٹالتے تھے۔ پاکستان میں بھی ان کا وقار قائم تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ ان کی شاعری بھی بہتر ہو گئی تھی۔ مگر اس میں جو ایک قسم کی بے ساختگی اور ایک طرح کی والہانہ کیفیت تھی، ایک اچھوتا بانکپن تھا وہ یقیناً نہیں رہا تھا۔ اس کے بدلے سنجیدگی اور روحانی بالیدگی در آئی تھی۔ پہلے دل سے شعر کہتے تھے۔ اب دماغ سے کہنے لگے تھے ؎

ببیں کرامتِ بت خانۂ مرا اے شیخ — کہ چوں خراب شود خانۂ خدا گردد

دل کی بیماری نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ آہستہ آہستہ جگؔر صاحب کی صحت

جواب دیتی چلی گئی۔ دو سال ہوئے کراچی میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ ویسے ہی ہشاش بشاش تھے اور اسی گرم جوشی سے ملے تھے۔ اسی طرح پوری آواز سے اپنا کلام سناتے تھے لوگ فرمائش کر کر کے ان سے پہلا کلام سنتے تھے۔ خوش ہو کر سناتے تھے۔ ایک مشاعرے میں دور پیچھے سے آواز آئی "جگؔر صاحب وہ سنائیے جس میں ہرن ٹہل رہے ہیں"۔ یعنی ٹہل رہے ہیں جگؔر صاحب نے مسکرا کر اپنا فارسی کا مشہور سراپا سنا دیا جس میں آخر میں "آہو خرامے" آتا ہے وطن واپس پہنچے تو دل کے شدید دورے پڑنے لگے۔ صاحبِ فراش ہو گئے مہینوں زندگی اور موت میں ان پر چھینا جھپٹی ہوتی رہی۔ اسی بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا ؎

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

شاہد احمد دہلوی

نام دیو مالی
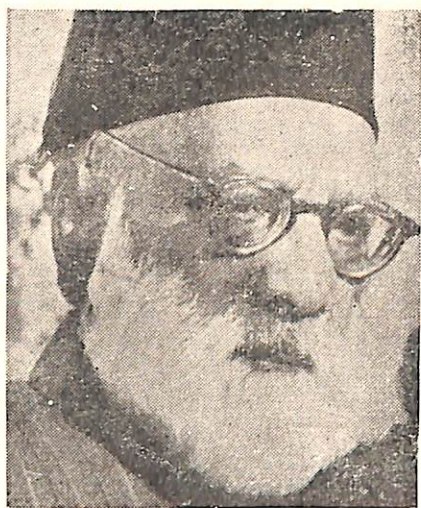
مولوی عبدالحق
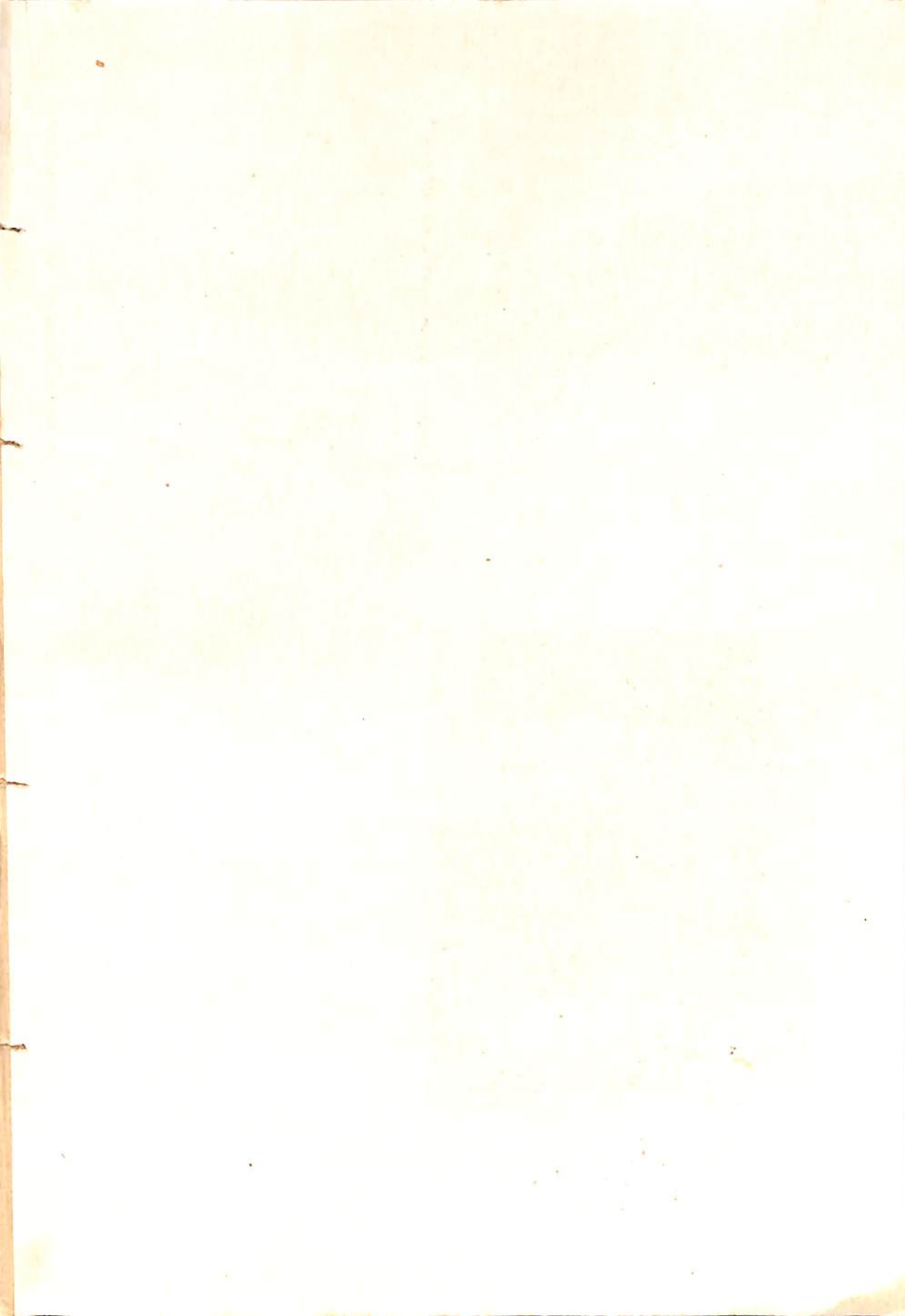
مولوی عبدالحق

مولوی صاحب ۱۸۶۹ء میں ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ سے بی۔
اے پاس کیا اور وہیں سرسیّد اور مولانا حالی سے صحبتیں رہیں۔ پھر عثمانیہ کالج
اورنگ آباد کے پرنسپل اور حیدرآباد دکن میں جامعہ عثمانیہ کے صدرِ شعبہ اُردو
مقرر ہوئے۔ پچاس سال تک انجمن ترقی اُردو کے سکریٹری رہے۔ ۱۹۳۵ء میں انجمن
کا دفتر حیدرآباد دکن سے دلّی منتقل کیا اور یہیں مقیم ہو گئے۔

آپ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے الٰہ آباد یونیورسٹی نے اپنی گولڈن
جوبلی (۱۹۳۷ء) کے موقع پر آپ کو ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

مولوی صاحب کی تحریروں میں سادگی، حلاوت، رنگینی اور مزاح کا دلکش
امتزاج ملتا ہے۔

مولوی عبدالحق نے ہر جگہ انسان دوستی، جفاکشی، راست گوئی، بے لوث

جذبۂ خدمت اور وضعداری پر زور دیا ہے۔ آپ کی تحریریں پڑھ کر ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ آپ کی نظر انسانیت کے حسن اور رفعت و عظمت کی شناسا ہے۔
مولوی عبدالحق نے اپنی تمام زندگی اردو کے لئے وقف کر دی تھی۔ آپ سنہ ۱۹۴۷ء میں کراچی چلے گئے تھے اور وہیں سنہ ۱۹۶۱ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

نام دیو مالی

نام دیو مقبرہ رابعہ دورانی اورنگ آباد (دکن) کے باغ میں مالی تھا ذات کا ڈھیڑ جو بہت نیچ قوم خیال کی جاتی ہے۔ قوموں کا امتیاز مصنوعی ہے اور رفتہ رفتہ نسلی ہو گیا ہے۔ سچائی، نیکی حسن کسی کی میراث نہیں۔ یہ خوبیاں نیچی ذات والوں میں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی اونچی ذات والوں میں ؎

قیس ہو کوہ کن ہو یا حالی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

مقبرے کا باغ میری نگرانی میں تھا۔ میرے رہنے کا مکان بھی باغ کے احاطے ہی میں تھا۔ میں نے اپنے بنگلے کے سامنے چمن بنانے کا کام نام دیو کے سپرد کیا۔ میں اندر کمرے میں کام کرتا رہتا تھا۔ میری میز کے سامنے بڑی سی کھڑکی تھی۔ اس میں سے چمن صاف نظر آتا تھا لکھتے لکھتے کبھی نظر اٹھا کر دیکھتا تو نام دیو کو ہمہ تن اپنے کام میں مصروف پاتا۔ بعض دفعہ اس کی حرکتیں دیکھ کر بہت تعجب ہوتا۔ مثلاً کیا دیکھتا ہوں کہ نام دیو ایک پودے کے سامنے بیٹھا اس کا تھانولا

صاف کر رہا ہے۔ تھانولا صاف کرکے حوض سے پانی لیا اور آہستہ آہستہ ڈالنا شروع کیا۔ پانی ڈال کر ڈول درست کی اور ہر رُخ سے پودے کو مڑ مڑ کر دیکھنا۔ پھر اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹ کر اسے دیکھنے لگا۔ دیکھتا جاتا تھا اور مسکراتا اور خوش ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ کام اسی وقت ہوتا ہے جب اس میں لذّت آنے لگے۔ بے مزہ کام، کام نہیں بیگار ہے۔

اب مجھے اس سے دلچسپی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ بعض وقت اپنا کام چھوڑ کر اسے دیکھا کرتا۔ مگر اُسے کچھ خبر نہ ہوتی کہ کوئی دیکھ رہا ہے یا اس کے آس پاس کیا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے کام میں مگن رہتا اس کے کوئی اولاد نہ تھی وہ اپنے پودوں اور پیڑوں ہی کو اپنی اولاد سمجھتا تھا اور اولاد کی طرح ان کی پرورش اور نگہداشت کرتا۔ ان کو سرسبز اور شاداب دیکھ کر ایسا ہی خوش ہوتا جیسے ماں اپنے بچوں کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ وہ ایک ایک پودے کے پاس بیٹھتا، ان کو پیار کرتا، جھک جھک کے دیکھتا اور ایسا معلوم ہوتا گویا ان سے چپکے چپکے باتیں کر رہا ہے۔ جیسے جیسے وہ بڑھتے، پھولتے پھلتے اس کا دل بھی بڑھتا اور پھولتا پھلتا تھا، ان کو توانا اور ٹانٹا دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ جاتی کبھی کسی پودے میں اتفاق سے کیڑا لگ جاتا یا کوئی اور روگ پیدا ہو جاتا تو اُسے بڑا فکر ہوتا۔ بازار سے دوائیں لاتا۔ باغ کے داروغہ یا مجھ سے کہہ کر منگاتا۔ دن بھر اسی میں لگا رہتا۔ اور اس پودے کی ایسی سیوا کرتا جیسے کوئی ہمدرد اور نیک دل ڈاکٹر اپنے عزیز بیمار کی کرتا ہے۔ ہزار جتن کرتا اور اسے بچا لیتا۔ اور جب تک وہ تندرست نہ ہو جاتا اسے چین نہ آتا۔ اس کے لگائے ہوئے پودے ہمیشہ پروان چڑھے اور کبھی کوئی پیڑ ضائع نہ ہوا۔

باغوں میں رہتے رہتے اُسے جڑی بوٹیوں کی بھی شناخت ہوگئی تھی۔ خاص کر
بچوں کے علاج میں اسے بڑی مہارت تھی۔ دور دور سے لوگ اس کے پاس بچوں کے
علاج کے لئے آتے تھے۔ وہ اپنے باغ ہی میں سے جڑی بوٹیاں لاکر بڑی شفقت
اور غور سے ان کا علاج کرتا۔ کبھی کبھی دوسرے گاؤں والے بھی اُسے علاج کے
لئے بلالیجاتے۔ بلا تامل چلا جاتا۔ مفت علاج کرتا اور کبھی کسی سے کچھ نہیں لیتا تھا۔
وہ خود بھی بہت صاف ستھرا رہتا تھا اور ایسا ہی اپنے چمن کو بھی رکھتا اسقدر
پاک صاف جیسے رسوئی کا چوکا۔ کیا مجال جو کہیں گھاس پھوس یا کنکر پتھر پڑا رہے۔
روشیں باقاعدہ، تھانولے درست، سینچائی اور شاخوں کی کاٹ چھانٹ وقت پر۔
جھاڑنا بہارنا صبح شام روزآنہ۔ غرض سارے چمن کو آئینہ بنا رکھا تھا۔

باغ کے داروغہ (عبدالرحیم فنیسی) خود بھی بڑے کارگزار اور مستعد شخص ہیں اور
دوسروں سے بھی کھینچ تان کر کام لیتے ہیں۔ اکثر مالیوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنی پڑتی ہے۔
ورنہ ذرا بھی نگرانی میں ڈھیل ہوئی، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔ یا بیڑی پینے لگے۔ یا
سائے میں جا لیٹے۔ عام طور پر انسان فطرتاً کاہل اور کام چور واقع ہوا ہے۔ آرام
طلبی ہم میں کچھ موروثی ہوگئی ہے۔ لیکن نام دیو کو کبھی کچھ کہنے سننے کی نوبت نہ آئی۔
وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے کام میں لگا رہتا۔ نہ ستائش کی تمنّا نہ صلے کی پروا۔

ایک سال بارش بہت کم ہوئی۔ کنوؤں اور باولیوں میں پانی برائے نام رہ
گیا۔ باغ پر آفت ٹوٹ پڑی۔ بہت سے پودے اور پیڑ تلف ہوگئے۔ جو بچ رہے وہ
ایسے نڈھال اور مرجھائے ہوئے تھے جیسے دِق کے بیمار، لیکن نام دیو کا چمن ہرا بھرا
تھا۔ اور وہ دُور دُور سے ایک ایک گھڑا پانی کا سر پہ اٹھا کے لاتا اور پودوں کو سینچتا۔

یہ وہ وقت تھا کہ قحط نے لوگوں کے اوسان خطا کر رکھے تھے اور انھیں پینے کو پانی مشکل سے میسّر آتا تھا۔ مگر یہ خدا کا بندہ کہیں نہ کہیں سے لے ہی آتا۔ اور اپنے پودوں کی پیاس بجھاتا۔ جب پانی کی قلت اور بڑھی تو اس نے راتوں کو بھی پانی ڈھو ڈھو کے لانا شروع کیا۔ پانی کیا تھا، یوں سمجھئے کہ آدھا پانی اور آدھی کیچڑ ہوتی تھی۔ لیکن یہی گدلا پانی پودوں کے حق میں آبِ حیات تھا۔

میں نے اس بے مثل کارگزاری پر اُسے انعام دینا چاہا تو اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ شاید اس کا کہنا ٹھیک تھا کہ اپنے بچوں کو پالنے پوسنے میں کوئی انعام کا مستحق نہیں ہوتا۔ کیسی ہی تنگی ترشی ہو تو وہ ہر حال میں کرنا ہی پڑتا ہے۔

جب اعلیٰ حضرت حضور نظام کو اورنگ آباد کی خوش آب و ہوا میں باغ لگانے کا خیال ہوا تو یہ کام ڈاکٹر سیّد سراج الحسن (نواب سراج یار جنگ بہادر) ناظم تعلیمات کے تفویض ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کا ذوقِ باغبانی مشہور تھا۔ مقبرہ رابعہ دورانی اور اس کا باغ جو اپنی ترتیب و تعمیر کے اعتبار سے مغلیہ باغ کا بہترین نمونہ ہے مدّت سے ویران اور سنسان پڑا تھا۔ وحشی جانوروں کا مسکن تھا اور جھاڑ جھنکار سے پٹا پڑا تھا۔ آج ڈاکٹر صاحب کی بدولت سرسبز شاداب اور آباد نظر آتا ہے۔ اب دور دور سے لوگ اُسے دیکھنے آتے اور سیر و تفریح سے محظوظ ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو آدمی پرکھنے میں بھی کمال تھا وہ نام دیو کے بڑے قدردان تھے اسے مقبرے سے شاہی باغ میں لے گئے۔ شاہی باغ آخر شاہی باغ تھا۔ کئی کئی نگراں کار اور بیسیوں مالی اور مالی بھی کیسے، ٹوکیو سے جاپانی، تہران سے ایرانی، اور شام سے شامی آئے تھے ان کے بڑے ٹھاٹ تھے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی اوپج تھی۔ وہ شاہی باغ کو حقیقت

میں شاہی باغ بنانا چاہتے تھے۔ یہاں بھی نام دیو کا وہی رنگ تھا۔ اس نے نہ فنِ باغبانی کی کہیں تعلیم پائی تھی اور نہ اس کے پاس کوئی سند یا ڈپلوما تھا۔ البتہ کام کی دھن تھی۔ کام سے سچّا لگاؤ تھا۔ اور اسی میں اس کی جیت تھی۔ شاہی باغ میں بھی اسی کا کام رہا کاج رہا۔ دوسرے مالی لڑتے جھگڑتے، سندھی شراب پیتے، یہ نہ کسی سے لڑتا جھگڑتا نہ سندھی شراب پیتا۔ یہاں تک کہ کبھی بیڑی بھی نہ پی۔ بس یہ تھا اور اس کا کام۔

ایک دن نہ معلوم کیا بات ہوئی کہ شہد کی مکھیوں کی یورش ہوئی۔ سب مالی بھاگ کر چھپ گئے۔ نام دیو کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ برابر اپنے کام میں لگا رہا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ قضا اس کے سر پر کھیل رہی ہے۔ مکھیوں کا غضبناک جھلّڑ اس غریب پر ٹوٹ پڑا۔ اتنا کاٹا اتنا کاٹا کہ بے دم ہو گیا۔ آخر اسی میں جان دیدی۔ میں کہتا ہوں کہ اُسے شہادت نصیب ہوئی۔

وہ بہت سادہ مزاج بھولا بھولا اور منکسر مزاج تھا۔ اس کے چہرے پر بشاشت اور لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ چھوٹے بڑے ہر ایک سے جھک کر ملتا۔ غریب تھا اور تنخواہ بھی کم تھی اس پر بھی اپنے غریب بھائیوں کی بساط سے بڑھ کر مدد کرتا رہتا تھا۔ کام سے عشق تھا اور آخر کام کرتے کرتے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

گرمی ہو یا جاڑا۔ دھوپ ہو یا سایہ وہ دن رات برابر کام کرتا رہا لیکن اُسے کبھی یہ خیال نہ آیا کہ میں بہت کام کرتا ہوں یا میرا کام دوسروں سے بہتر ہے۔ اسی لئے اُسے اپنے کام پر فخر یا غرور نہ تھا۔ وہ یہ باتیں جانتا ہی نہ تھا۔ اسے کسی سے بیر تھا

نہ جلایا۔ وہ سب کو اچھا سمجھتا اور سب سے محبّت کرتا تھا۔ وہ غریبوں کی مدد کرتا، وقت پر کام آتا، آدمیوں جانوروں، پودوں کی خدمت کرتا۔ لیکن اسے کبھی یہ احساس نہ ہوا کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ نیکی اسی وقت تک نیکی ہے جب تک آدمی کو یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ جہاں اس نے یہ سمجھنا شروع کیا، نیکی نیکی نہیں رہتی۔

جب کبھی مجھے نام دیو کا خیال آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ نیکی کیا ہے۔ اور بڑا آدمی کسے کہتے ہیں۔ ہر شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے۔ اس صلاحیت کو درجۂ کمال تک پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے۔ درجۂ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان انسان بنتا ہے۔ یہ سمجھو کندن ہو جاتا ہے، حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہوگی خدا یہ نہیں پوچھے گا کہ تو نے کتنی اور کس کی پوجا پاٹ یا عبادت کی۔ وہ کسی عبادت کا محتاج نہیں۔ وہ پوچھے گا تو یہ پوچھے گا کہ میں نے جو استعداد تجھ میں ودیعت کی تھی اسے کمال تک پہنچانے اور اس سے کام لینے میں تو نے کیا کیا اور خلق اللہ کو اس سے کیا فیض پہنچایا۔ اگر نیکی اور بڑائی کا یہ معیار ہے تو نام دیو نیک بھی تھا اور بڑا بھی۔ تھا تو ذات کا ڈھیڑ پر اچھے اچھے شریفوں سے زیادہ شریف تھا۔

مولوی عبدالحق
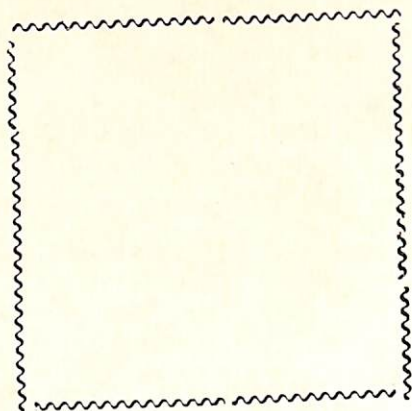
ایوب عباسی

رشید احمد صدیقی

رشید احمد صدیقی

رشید صاحب ۱۸۹۶ء میں جون پور کے ایک دیہات مڑیاہو میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم، اے کیا اور وہیں اردو کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔

رشید صاحب طنز و مزاح میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ آپ کے مضامین میں انفرادیت اور ایک مخصوص شان ہوتی ہے۔ آپ کی تحریریں شگفتہ، شستہ اور مزاح سے بھرپور ہوتی ہیں۔ آپ کی زبان حسین ادبی آرائشوں سے بہرہ ور ہوتی ہے اور ذہن کی رچی ہوئی شائستگی کو بڑے نکھرے ہوئے انداز میں نمایاں کرتی ہے۔

شخصیت نگاری میں رشید صاحب کا زاویہ نگاہ سب سے الگ ہے وہ بے ریا زندگی، بے لوث محبت اور مشرقی شائستگی کے دلدادہ ہیں اور ان

محاسن کو دوسروں میں بھی تلاش کر لیتے ہیں۔ آپ کے لکھے ہوئے مضامین اور خاکے اسی نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے ہیں۔
آپ آجکل علی گڑھ میں مقیم ہیں۔

ایوبؔ عبّاسی

تمہاری نیکیاں زندہ تمہاری خوبیاں باقی!

محمد ایوبؔ عباسی مرحوم کے بارے میں کیا کہوں اور کہاں سے شروع کروں! وہ اتنے اچھے تھے اتنے ارزاں تھے اور اتنے ناگزیر تھے کہ ان کے بارے میں کچھ کہنا شروع کروں تو سب سے پہلے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ نہیں وہ یہاں سے نہیں وہاں سے۔ ابھی نہیں آگے چل کر۔ یوں نہیں ووں۔

وہ موجود تھے تو ان کی مثال نعائم فطرت کی تھی، مثلاً ہوا، پانی، روشنی جو اس درجہ عام و ارزاں ہیں کہ ان کی طرف توجہ مائل نہیں ہوتی۔ لیکن ان میں سے، کسی میں کہیں سے کوئی فرق آجاتے تو پھر دیکھیے کیسی کیسی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ اور یہی ناقابلِ التفات چیزیں کیسی نعمتیں بن جاتی ہیں۔

ایوبؔ ایسے ہی تھے۔ وہ دوستوں کی زندگی میں اس طرح اور اس درجہ گھُل مِل گئے تھے کہ ہم سب کو ان کی موجودگی کا احساس تک نہیں ہوتا تھا، لیکن جب وہ ہم سے رخصت ہو گئے تو ہم میں سے ہر ایک نے یہ محسوس کیا کہ جو چیز ناقابلِ التفات حد تک ارزاں و عام

تھی۔ وہی ناقابلِ بیان حد تک اچھی، ضروری اور نایاب تھی۔

ہم سب کی زندگیوں میں مرحوم کے گھل مِل جانے کا راز یہ تھا کہ ان میں بظاہر کوئی بات غیر معمولی نہ تھی۔ وہ غیر معمولی قابلیت کے آدمی نہ تھے، دولت مند نہ تھے، کچھ بہت ذہین بھی نہ تھے۔ نہ انھیں جوڑ توڑ آتا تھا۔ نہ خوش پوشاک، نہ خوش گفتار۔ نہ خوش باش، نہ رنگین و رعنا۔ وہ معمولی آدمیوں سے بھی زیادہ معمولی تھے۔ پھر بھی وہ ایسے تھے کہ اب ہم میں ویسا کوئی نہیں اور نہ اب ڈھونڈھے سے بھی کوئی ملے۔

سیاہ فام، چیچک رو، پست قد، نحیف الجثہ۔ پہلے کوئی دیکھے تو منہ پھیر لے۔ برت لے تو غلام بن جائے۔ میں بتا نہیں سکتا کہ ایوب کی خوبیوں نے ان کی بدہیئتی کو کس درجہ دل آویز بنا دیا تھا۔ فطرت اپنی چوک کی بسا اوقات کیسی بے دریغ بخشش سے تلافی کرتی ہے۔ میری ہی نہیں میرے عزیزوں اور دوستوں کی بھی اُن سے بڑی پرانی ملاقات چلی آئی تھی اور میں نہیں بتا سکتا کہ ہم سب کی زندگی میں ایوب کس قدر دخیل تھے اور ان کی موت نے ہم سب کو کیسا بے قرار و مایوس اور کس درجہ بے دست و پا کر دیا۔ وہ میرے ہی دیار کے تھے اور ایک بڑے مستند شریف ذی علم اور صاحب خیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ میں علی گڑھ میں تھرڈ ایر میں تھا جب ایوب فسٹ ایر میں داخل ہوئے۔ بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی ہوکر پروسٹ آفس میں ملازمت کر لی اور علیگڑھ ہی میں رہ بس گئے۔ اسکول کی تعلیم کے دوران میں وہ میرے عزیزوں و خوردوں کے ہم سبق تھے۔ علی گڑھ آئے تو ہم سب ایک ہو گئے اور سترہ اٹھارہ سال تک ہر رنج و راحت میں ایک دوسرے کے شریک رہے۔ یہ تو تھے میرے ذاتی تعلقات۔ اسی قسم اور درجہ کے تعلقات مرحوم کے اوروں سے بھی تھے اور سب جانتے ہیں کہ اُن کی جدائی

کا جو الم مجھے ہے اس سے کم دوسروں کو نہیں ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے، اس پیکرِ حقیر میں دلسوزی و خود سپاری کا کیسا بے گراں و بیش قیمت خزانہ ودیعت تھا۔

مجھ پر، میرے بچوں پر، میرے دوستوں پر اور میرے خاندان پر جان چھڑکتے تھے۔ خوشی کی بات ہو تو ایوب صاحب سب سے پہلے موجود اور سب سے زیادہ خوش۔ رنج و تردّد کا موقع ہو تو سب سے پہلے حاضر، بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے یا ہر شخص کی خوشامد کر رہے ہیں۔ خوشی میں ہر طرح کے جملے فقرے سر کر رہے ہیں اور اپنی مسرّت کا طرح طرح سے اظہار کر رہے ہیں۔ رنج و مایوسی کا موقع ہو تو ایک حرف زبان پر نہیں۔ نہ تسکین کا نہ تقویت کا۔ چپ چاپ بیٹھے سراپا کا جائزہ لے رہے ہیں۔ یا محبت و ہمدردی سے بے اختیار ہو ہو کر منہ تک رہے ہیں۔ ذرا بھی احتمال ہوا کہ کسی کا آنا یا کسی معاملہ میں میرا دخل میرے لئے تکلیف دہ ہوگا تو اسے پہلے ہی سے بھانپ کر کسی نہ کسی طرح اس کا سدِّباب کر دینا اور اس طرح کرنا کہ مجھے کان و کان خبر نہ ہو۔

میرا اور میرے دوستوں کا یہ حال تھا کہ ہاتھ پاؤں ہلانا نہ ہوا اور ایوبؔ سب کام کر دے۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی تھیں جن کی تمام تر ذمہ داری ہمیں پر ہوتی تھی لیکن اس سے بذاتِ خود عہدہ برآ ہونے کے بجائے یا اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہو تو ہم سب ایّوب صاحب ہی پر بگڑتے تھے اور بہانے نکال نکال کر انھیں سخت، سست کہتے تھے۔ ایّوب صاحب معمولی ملگجی شیروانی پہنے، ٹوٹا پھوٹا جوتا، میلا سا مفلر گلے میں لپیٹے جلدی جلدی چلے آ رہے ہیں۔ ہائے ان کا وہ چھوٹا سا قد۔ مشکل سے پانچ فٹ کا۔ مشغول و منہمک۔ مفلر جلد جلد کھولتے لپیٹتے۔ راستے میں ہر ایک سے کچھ کہتے کچھ سنتے، گرتے پڑتے چلے آ رہے ہیں۔ ابھی فاصلہ ہی پر ہیں کہ جس شخص کے پاس آ رہے ہیں

اس نے صلواتیں سنانی شروع کردیں۔ آپ پہنچے تو سخت سست کی بوچھاڑ، ایوب صاحب ہیں کہ نادم ہیں۔ ہنستے جا رہے ہیں۔ معذرت کر رہے ہیں۔ دو چار صلواتیں خود بھی سنا دیں۔ غرض دو چار منٹ کے بعد اطمینان ہوا تو ٹھکانے کی باتیں ہونے لگیں۔ وعدہ کیا کہ کام کردیں گے۔ نہ کریں تو جو چاہے کرڈالیئے۔ چلنے لگے تو پھر کام کی تاکید کی گئی۔ پانچ سات صلواتیں سنا دی گئیں اور اتنی ہی سن لی گئیں۔

ایوبّ صاحب کا گھر بارہ مہینے تھرڈ کلاس کا مسافر خانہ بنا رہتا تھا۔ ہر طرح کے لوگ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ بالخصوص اعزّا اور دوستوں کے لڑکے۔ مجھے یقین ہے اور میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ ایوبّ صاحب کے گھر میں قیام کرکے ان کے خرچ سے ان کی توجہ و محنت سے اور ان کے بل پر اعزا اور احباب کے جتنے لڑکوں نے علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی ہوگی اتنا اب تک کسی اور شخص سے نہ اب تک ہوا اور نہ شاید آئندہ ہو۔

ان کے گھر میں طالب علموں کا وہ ہجوم کہ اندر جا کر دم گھٹنے لگتا تھا۔ ہر شخص کو کھلانا پلانا، سامان دینا، ان کی ضرورتوں کو نظر میں رکھنا اور ان کی فکر کرنا اس کے بعد آفس کا کام، دوستوں کا کام، غرض اس شخص کی مشغولیتیں دیکھ کر ہم سب تعجّب کیا کرتے تھے کہ یہ شخص زندہ کیسے ہے اور اس کے حواس کیونکر بجا ہیں۔

اس کا اندازہ آپ یوں کرسکتے ہیں کہ ایوب صاحب نے شاید ہی کبھی اپنے گھر کھانا کھایا ہو یا دو روز مسلسل اپنے گھر سوئے ہوں۔ جہاں مل گیا وہیں کھا لیا اور ہوسکا تو وہیں رات بھر کے لئے پڑ رہے۔ چارپائی بستر میسّر آئے یا نہ آئے آرام کرسی پر سو لیے۔ میز پر لیٹ گئے ورنہ کچھ لپیٹ کر فرش پر ہی ایک طرف سکڑ سکڑا کر رات بسر کردی۔ مشکل سے ایک آدھ چپاتی اور تھوڑا سا سالن کھاتے تھے۔ اتنا کم کھانے والا بھی شاید ہی

کہیں ملے کبھی کبھی ایک آدھ پیالی چائے پر ہی اکتفا کر لیتے تھے۔

سگرٹ اور حقّے کے زیادہ شائق تھے۔ بیڑی، سگرٹ، سگار، حقّہ جو مل جائے وہ ان کے لئے کفایت کرتا تھا۔ دوستوں میں سے کوئی بیمار پڑا، اور یہ آموجود ہوئے رات دن کا مسلسل قیام۔ پاؤں دبا رہے ہیں، سر میں تیل ڈال رہے ہیں، دوا لا رہے ہیں کھانا تیار کر رہے ہیں اور بقول ہم پورب والوں کے اس کا گُو مُوت کر رہے ہیں۔ بیماری میں آدمی چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی ہر قسم کی زیادتیاں بھی سہہ رہے ہیں۔ بیمار اچھا ہوا تو شکریہ میں بھی سخت سست ہی کلمات کہے۔ ایّوب صاحب ہیں کہ خوش ہیں۔ لیکن یہ یاد رہے کہ ایّوب صاحب کو جو لوگ صلواتیں سناتے تھے وہ سب ایّوب صاحب کے گرویدۂ احسان ہو کر شعراء اور بے فکروں نے لطف و تشکّر کے جتنے الفاظ وضع کئے ہیں وہ سب ان گالیوں کے سامنے ہیچ تھے جو ہم سب ایّوب کو دیتے تھے اور ان سے سنتے تھے!

ایک دفعہ بیوی بچے مکان گئے، میں اور دو بچیاں رہ گئیں۔ باورچی یک بیک چلا گیا۔ برسات کا موسم تھا میں دن بھر اِدھر اُدھر مارا مارا پھرا۔ کوئی پانچ چھ بجے شام گھر واپس ہوا۔ دیکھا تو ہر چیز قرینہ سے مکان میں لگی ہوئی ہے بچّیاں صحن میں آم کھا رہی ہیں۔ ذرا ہی دیر میں ایّوب صاحب آنکھ ملتے، راکھ میں لت پت باورچی خانہ سے ڈانٹ کر بولے ”جی یہ گلچھرّے اڑائیے، لکڑیاں بھیگی ہوئی ہیں۔ چولہا ٹوٹا ہوا ہے“ میں نے کہا ”کیا ہوا؟ (کچھ سخت و سست الفاظ کے بعد) آخر ڈائننگ ہال کو کیا ہوا تھا؟“ وہیں سے انتظام کر لیا ہوتا“ بولے ”جی شام کے پانچ چھ بجے آپ کے لئے ڈائننگ ہال سے باقرخانیاں نہ آ جاتیں۔ بچیاں کیا کرتیں“ بعد کو معلوم ہوا کہ آفس سے

براہِ راست شہر گئے۔ وہاں سے بچیوں کے لئے آم اور پکانے کے لئے کچھ ساگ ترکاری لائے۔ بچیوں کو آم میں پھنسا کر خود باورچی خانہ میں پل پڑے۔ ترکاری ساگ اور کچھ اسی قسم کی چیزوں سے الجھے ہوئے تھے میں نے کہا "بھئی ایوب خدا کے لئے کچھ تو ٹھکانے کی چیز کھا پی لیا کرو۔ ورنہ آنکھیں بھیک مانگنے لگیں گی" بولے "جناب نے بھی تو منجن ہی کھا کھا کر عینک کے نمبر بڑھائے ہیں۔"

کھانا پینا ہو چکا تو آم نکالے۔ میرے سامنے تو قلمی اور لنگڑے رکھے اور خود چوسنے والے آم لئے، میں نے کہا "یہ آم کیوں نہیں لیتے؟" کہنے لگے "یہ آپ ہی کو مبارک ہوں۔ مجھے تو چوسنے والے ہی پسند ہیں" میں نے کہا "چوسنے والے اپنے گھر کھائیے گا۔ میرے ہاں اس قسم کی قومی حرکت کروگے تو مجھ سے برا کوئی نہیں" کھانا پینا ختم ہوا تو اپنی کھری چارپائی بچیوں کی چارپائی کے درمیان بچھا کر لیٹ رہے اور ان سے انہی کی دلچسپی کی ادھر ادھر کی باتیں کرنی شروع کر دیں۔ جب وہ سوگئیں تو سر سے پاؤں تک کمل تان کر خاموش ہو گئے۔ میں نے دیکھا تو کہا "ایوب تم اس گھر سے نکلو۔ اس سڑی گرمی میں کمبل اوڑھ کر برآمدہ میں سوؤ گے تو ظاہر ہے تمام رات میں صحن کے اس چبوترہ پہ رقص کروں گا۔ کیا فائدہ صبح میں پاگل خانہ پہنچایا جاؤں اور تم قبرستان" نہ مانے اور اسی طرح سوئے ان کا یہی معمول تھا۔

صبح جیتے جاگتے اٹھ بیٹھے اور دوں کے دھندے میں لگ گئے۔ علی گڑھ میں داخلہ کا زمانہ بڑے ہنگامے کا ہوتا ہے۔ سارے بزرگانِ قوم جو سال بھر ہم سب کو گالیاں اور احتیاطات کو پیام دیتے رہتے ہیں۔ نئے سیشن کے شروع ہوتے ہی ہم کو قرونِ اولیٰ کا مسلمان قرار دیتے ہیں۔ پہلے خطوط آنے شروع ہوں گے اس کے بعد تار اس کے

بعد تانگے "خلاصہ فریاد"، ایک ہی ہوتی ہے یعنی لڑکا آپ کا ہے۔ یونیورسٹی قوم کی ہے اور حکومت ہندوؤں کی۔ لڑکے کو داخل کرائیے جتنی مراعات ہوسکیں دلوائیے بقیہ خود پوری کیجئے چال چلن اور خواندگی کی نگرانی کیجئے، پاس کرائیے۔ نوکری دلوائیے اور ہم دونوں کو اس وقت تک مہمان رکھئے جب تک کہ لڑکا یہاں کے ماحول سے آشنا اور خود ان سے متنفر نہ ہوجائے! حج اور تیرتھ کے بارہ میں تو یہ طریقہ ہے کہ ملکوں کے مختلف حلقے مطوف اور پنڈوں نے بانٹ لئے ہیں۔ آپ چاہیں یا نہ چاہیں یہ آپ کی جان و مال کے ذمہ دار! خدائی فوجدار ہیں جان کے کم مال کے زیادہ۔ علی گڑھ کا دستور اس سے بالکل مختلف ہے۔ جس کا جی چاہے جس جس مطوف یا پنڈے کے ہاں ٹھہر جائے اور اس کی جان مال و ناموس کا لاگو بن جائے۔ داخلہ کا زمانہ عین برسات کا ہوتا ہے ظاہر ہے برسات میں شکم پروری اور قوم کی مرثیہ خوانی کا بیک وقت زور ہو اور کام کوئی نہ ہو تو معدہ کب تک ساتھ دے گا۔ والدین[1] میں سے کوئی پیچش میں مبتلا ہے۔ کوئی اسہال میں

---

[1] یہ لفظ لغوی معنوں میں نہیں استعمال ہوا ہے۔ یہ علی گڑھ میں ترک موالات کے زمانہ کی یادگار ہے جب ہر لڑکے کا کوئی نہ کوئی بزرگ اپنے لڑکے کو سمجھانے، سنبھالنے علی گڑھ آیا تھا۔ اس زمانہ میں طرح طرح کے بزرگوں کی اتنی کثرت ہوگئی تھی کہ لوگ گھبرا گئے تھے۔ چنانچہ اب جس لڑکے کے ساتھ کسی غیر معمولی لیکن چالیس سال سے زائد عمر کے بزرگ کو کوئی دیکھ لیتا ہے فوراً کہہ پڑتا ہے "فھوالوالدین"۔ یہاں تک کہ اگر کسی لڑکے کے ساتھ گھر کا کوئی پرانا نوکر بھی آئے تو لوگ کہیں گے فلاں صاحب کے ساتھ "ایک والدین" بھی ہے۔ ایک والدین کا فقرہ علی گڑھ میں قطعاً موزوں سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً میں فلاں جگہ جا رہا تھا راستہ میں ایک والدین ملے۔ چنانچہ علی گڑھ کی لغت میں والدین کے معنی خواہ مخواہ ماں باپ کے نہیں ہیں بلکہ کوئی بزرگ نما صورت کا اجنبی جو کسی طالب علم سے وابستہ نظر آجائے۔ والدین ہے۔

کسی کو یونانی علاج موافق نہیں آتا کسی کو ڈاکٹری دوا سے اصولاً اختلاف ہے۔ کھانا، ناشتہ سب کو موافق۔ حکیم صاحب کے ہاں لے جائیے یا انھیں بلائیے تو بتائیں گے موجودہ تکالیف اور علاج کرائیں گے۔ دیرینہ ناگفتہ بہ شکایت کا!

اس زمانے میں اور ایسے مواقع پر ایوب مرحوم کام آتے تھے۔ کسی کے لئے چارپائی کی ضرورت ہے تو وہ لا رہے ہیں۔ کسی کے پاس سارٹیفیکٹ نہیں ہے اس کی سبیل نکال رہے ہیں کسی کو مخصوص بورڈنگ ہاؤس میں جگہ نہیں مل رہی ہے تو اس کے لئے دوڑ دھوپ کر رہے ہیں۔ کسی کے پاس روپے نہیں ہیں تو ادائیگی بالاقساط کی کوشش کر رہے ہیں۔ کسی کے پاس کتاب یا فرنیچر نہیں ہے تو اس کا بندوبست کر رہے ہیں۔ کوئی اسٹریچی ہال کے محشرستاں میں کھو گیا ہے تو اسے راستہ پر لگا رہے ہیں۔ والدین یا سرپرستوں کے لئے حقّہ یا پرانے اردو ناولوں کی ضرورت ہے تو اسے فراہم کر رہے ہیں۔

اور سب کچھ ہو گیا تو اشارہ کنایہ سے حیلہ حوالہ سے، خوشامد کر کے، ردیبیٹ کر، جھنجھلا کر آمادہ قتل یا خودکشی ہو کر مہمان کو میزبان کا گھر چھوڑنے اور اپنے اپنے ٹھکانے پہنچنے کا مرحلہ طے کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ ایک ہی جگہ نہیں ہو رہا ہے۔ میرے گھر، آپ کے گھر، دوستوں کے گھر اور خدا جانے اور کہاں کہاں یہی ڈرامہ ہو رہا ہے۔ ایوب صاحب ہیں کہ اپنے فرائض اور اپنی مصیبتوں کو نظر انداز کر کے دوستوں اور دوسروں کی مصیبت میں شریک ہیں۔ میزبان مہمانوں سے تو کچھ بولتا نہیں۔ لیکن آخر غم و غصّہ نکالنے کا کوئی موقع تو ہو۔ اس کے لئے ایوب صاحب تھے۔ انھیں بلایا گیا۔ یہ پہنچے تو کچھ متردّد ہوئے کچھ نادم اور کبھی تالی بجا کر قہقہہ لگانے لگے پھر بولے "معلوم ہوتا ہے کوئی اور آیا یا کسی اور کو دوست آئے۔ رشید صاحب! واللہ خوب ہوا بڑا مزا آ رہا ہے اور لکھئے مزاحیہ

مضمون!"[۱]

ایوب مرحوم کو برج کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔ ان کی زندگی میں اور کچھ ان ہی کی وجہ سے ہم لوگ بھی اس کے بڑے شائق ہو گئے تھے۔ بازی نہیں لگائی جاتی تھی۔ اس لئے کہ ہم میں ایک سے ایک اناڑی کھیلنے والا تھا، جتنا کھیلتے اتنا ہی کھیل میں تنزّل کرتے تھے۔ پھر ایک دوسرے کو خواہ وہ جیتے یا ہارے سخت سست اتنا کہہ لیتے تھے کہ کسی اور بدل کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی تھی۔ اس زمانے میں ہریجن کا لفظ اخبارات میں آیا تھا۔ بے تکلف صحبتوں میں ایوب مرحوم کا یہی نام رکھ دیا گیا تھا۔ مرحوم بھی کچھ کم نہ تھے۔ ہم سب کو بھی ایسے ناموں سے پکارتے تھے کہ ہمارا ہی جی جانتا ہے۔ اُن کے بغیر تاش کی صحبتیں بالکل بے کیف ہوتی تھیں۔ اکثر یہ ہوا کہ ایوب مرحوم کھیل میں موجود نہ ہوئے۔ تھوڑی ہی دیر میں سب نے تاش پھینک دیئے کہ بغیر ہریجن کے کوئی لطف نہیں۔ رات زیادہ گذر چکی ہے — ڈاکٹر عبادالرحمٰن خاں کی موٹر پر ہم سب ان کی تلاش میں نکلے، بڑی دوڑ دھوپ کے بعد کسی کے ہاں ملے۔ اپنے گھر چونکہ رہتے ہی نہ تھے، اس لئے ہم سب کبھی نہ گئے۔ دوست کے ہاں بھی رونقِ محفل وہی تھی۔ اس لئے وہ لوگ بھی مارنے مرنے پر تیار ہوئے کہ ایوب کو جانے

---

[۱] ایک دن میں اور ایوب مرحوم بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک اجنبی بزرگ ملنے آئے شکل سے کچھ قومی کچھ علمی اور تھوڑے بہت سزا یافتہ معلوم ہوتے تھے۔ اسی قسم کی باتیں کرتے کرتے حرفِ مطلب زبان پر لائے، یہ بھی ہو لیا تو اور باتیں شروع کر دیں۔ بالآخر رخصت ہونے لگے تو بولے۔ "رشید صاحب آپ جیسا مزاحیہ مضمون لکھنے والا کوئی اور نہیں!" ایوب صاحب اُٹھ کر کمرہ سے بھاگے بڑی دیر میں برآمد ہوئے۔ ہنستے ہنستے لوٹے جا رہے تھے اور بار بار کہتے تھے اور لکھیئے مزاحیہ مضمون!

نہ دیں گے۔ بڑی خوشامدوں سے یا جھگڑ کر انھیں لائے اور محفل پھر سے جمی۔

تاش کے شائق اتنے تھے، لیکن براہِ راست کبھی نہیں کہتے تھے کہ چلئے تاش کھیلا جائے۔ آئے اور بیٹھ گئے، اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کیں، میں خوب سمجھتا تھا کہ ان کا مطلب کیا ہے اس لئے عمداً غیر متعلق باتیں چھیڑتا رہا۔ یہ برابر داد خالی دیتے رہے۔ آخر کار میں نے کہا "ایوب تم کو تو تاش کا ہیضہ ہے۔" نہایت سنجیدگی سے بولے "جی ہاں، آپ لوگوں کو تو شاید چھینک بھی نہیں آتی۔"

میں تیار ہوا، دونوں ڈاکٹر اصغر کے ہاں پہنچے۔ ہم خوب سمجھتے تھے کہ وہاں کیا پیش آئے گا۔ ایوب مرحوم کو دیکھتے ہی للکارا "ہرگز دروازے کے اندر قدم نہ رکھنا"، مرحوم بولے "بس بس ڈاکٹر صاحب بہت زور نہ باندھیئے۔ دروازہ کے اندر سے خود تو کبھی قدم باہر نکالنے کی ہمت نہیں ہوتی اور بھبکی یہ! دیکھئے (اتنے میں ڈاکٹر عبادالرحمٰن خاں بھی آگئے تھے) معززینِ شہر تشریف لائے ہیں۔" اصغر صاحب بولے "لعنت ہے معززینِ شہر پر اور آپ پر بھی، اسی سانس میں نوکر کو آواز دی، میز بچھاؤ، پان دان لے چلو" ایوب مرحوم سے مخاطب ہو کر بولے "کیوں جی باورچی تلاش کیا؟" مرحوم بولے "بھیجا تو تھا آپ کو ملا نہیں؟" بولے "لعنت ہے، باورچی بھیجا تھا یا بھنگی! اپنی ہی شکل کا ڈھونڈتے ہو"، مرحوم نے نہایت سنجیدہ ہو کر جواب دیا "ڈاکٹر صاحب کیا کروں، آپ کی شکل والا تو یونیورسٹی والے نہیں چھوڑتے کیا کیا جائے۔"

ایوب صاحب کی سیرت و شخصیت کا عجیب اور نادر پہلو یہ تھا کہ بڑے سے بڑا آدمی ہو یا چھوٹے سے چھوٹا ان سے عزت آمیز محبت کرتا تھا ترس کھا کر یا مجبور ہو کر نہیں بلکہ ان سے محبت کرنے میں اُسے لطف آتا تھا ایوب سے محبت کر کے جیسے دِل کو تسکین ہو جاتی

تھی، ایک طرح کی پُرافتخار اور اطمینان بخش تسکین ہے۔ جیسے یہ احساس کہ ہم میں بھلائی کرنے یا بلند ہونے کا جذبہ یا استعداد ہے۔ محبت کی ایک قسم وہ بھی ہوتی ہے جو اپنے سے حقیر یا پست حال سے کی جاتی ہے۔ جیسے لوگ اپنے کتّے سے کرتے ہیں! یعنی اسے سمجھتے کتا ہی ہیں، لیکن چومتے چمکارتے رہتے ہیں۔ اس قسم کی محبّت بالعموم بڑے آدمی چھوٹے سے کرتے ہیں۔ لیکن ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ محبّت یا اخلاق کا مظاہرہ کرنے کے اعتبار سے تو لوگ انھیں انسان سمجھیں لیکن خود ان کے جذبۂ فرعونیت کی تسکین ہو۔ یعنی ہم ایسے ہیں کہ ترس کھا کر اپنے بندے سے محبت کرتے ہیں اور اس طور پر اس کی زندگی میں امید و تحرّک کی ہلکی سی لہر دوڑا کر ہم چشموں میں بیٹھنے اور سر بلند ہونے کے قابل بنا دیتے ہیں۔ اس طرح کی محبت یا عزت ایوب صاحب سے کرنے کی کسی کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ایوب صاحب وہ تھے جن کے لئے ہر شخص اپنی عزت یا شہرت کو داؤں پر لگا دینے کے لئے بے تامّل تیار ہو سکتا تھا۔

ایوب سے محبت نہ کیجئے یا ان کی عزت نہ کیجئے تو یہ محسوس ہوتا کہ ہم میں شریفانہ جذبات یا احساسِ ذمہ داری کی کمی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی مدّ نظر رکھئے کہ ایوب صاحب کے دل میں یہ بات کبھی گذری ہی نہیں کہ ان کی خدمات کا صلہ مل رہا ہے یا نہیں۔ معاوضہ کا احساس شاید ان میں پیدا ہی نہیں کیا گیا تھا۔ بڑے چھوٹے کی خدمت یکساں لطف و تن دہی سے کرتے تھے۔ پرووسٹ کے دفتر میں سب سے اہم عہدہ پر ہونے کے سبب ان کا سابقہ طلباء، اساتذہ، بیرا، باورچی، نائی، چپراسی، بھنگی، بہشتی سبھی سے ان کا براہ راست پڑتا تھا۔ طلباء کو خوش اور مطمئن رکھنا معمولی بات نہیں ہے۔ ان کا ایوب صاحب سے طرح طرح سے سابقہ پڑتا تھا۔ وہ ہر طالب علم کے

کے خاندانی حالات و معاملات سے واقف رہتے تھے اور اسی اعتبار سے ان سے سلوک کرتے تھے۔ اس لئے ہر طالب علم ان کو اپنے گھر کے بزرگ اور خیر اندیش کی حیثیت سے دیکھتا تھا۔ یونیورسٹی میں اسٹرائک ہے۔ لڑکے ہیں کہ بے قابو ہوئے جاتے ہیں لیکن ایوب صاحب کا جادو برابر کام کر رہا ہے۔ ایسے زمانے میں ان کا طرز عمل لڑکوں سے وہی ہوتا جو میدانِ جنگ میں صلیبِ احمر کا ہوتا ہے۔

ادنیٰ درجہ کے ملازمین سے ان کا سلوک مساوات اور ہمدردی کا ہوتا یہی وجہ تھی کہ یہ لوگ ایوب کو اپنا افسر نہیں بلکہ رفیق سمجھتے تھے۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ بہشتیوں کی کانفرنس کی صدارت کر رہے ہیں اور جیسا کہ ایسی کانفرنس میں ہوتا ہے ہر بہشتی آپے سے باہر تھا۔ ایوب صاحب جلدی جلدی سگرٹ پیتے اور بار بار پاجامہ اونچا کرتے جاتے تھے۔ ہر ایک سے مخاطب ہوتے تھے کبھی خود جامے سے باہر ہو جاتے اور کبھی نہایت متانت سے سمجھانے لگتے۔ میں اُدھر سے نکلا تو کچھ سٹ پٹائے اور شرمائے۔ میں نے کہا "واللہ، ایوب پہچاننا دشوار ہو گیا۔ جا کر مولانا[1] سے کہوں گا کہ نوح کا بسر بدوں میں بیٹھتے بیٹھتے بہشتیوں میں بیٹھنے لگا ہے!" ہاتھ پر ہاتھ مار کر بڑے زور سے ہنسے کہنے لگے "ہاتھ جوڑتا ہوں، ذرا بیٹھ جائیے۔ واللہ بڑا مزہ آئے گا"۔ میں نے کہا "جی نہیں، آپ کو کیا، آج یہ ہے کل بھنگیوں کی کانفرنس کی صدارت کرنے لگیں گے"۔ فرمایا "ہرج کیا، پانی اور فنائل کا انتظام تو کہیں گیا نہیں"۔ غرض میں چلا آیا۔ ایوب صاحب بھی صدارت

---

[1] مولانا ابوبکر محمد شیث فاروقی صاحب قبلہ ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ایوب صاحب کے عزیز قریب اور بزرگ۔

سے فارغ ہو کر تاش کھیلنے کے وقت پہنچ گئے۔

ایوب صاحب یونیورسٹی کے معاملات یا الجھنوں سے ہمیشہ علیحدہ رہتے اور حتی المقدور اپنے دوستوں کو بھی علیحدہ رکھنا چاہتے تھے۔ اس قسم کے مسائل پر انھوں نے مجھ سے گفتگو نہ کی۔ کبھی فرصت ہوئی اور یقین ہوا کہ میں گھبراؤں گا نہیں تو وہ اپنے خاندانی قضیوں کا تذکرہ چھیڑتے اور جو کچھ دل میں ہوتا بیان کر دیتے۔ میں اُن کی اُلجھنوں کو ہمدردی اور توجہ سے سنتا تو ایسا محسوس کرتے جیسے ان کا جی ہلکا اور ان کے دکھ درد کا مداوا ہو گیا۔ وہ اپنے رشتہ داروں سے کچھ بہت راضی نہ تھے۔ سب کے سب ایوب صاحب کی شرافت اور کشادہ دلی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے درپے رہتے تھے۔ اس کا انھیں غم تھا اور غم غلط ہی کرنے میرے پاس آیا کرتے تھے۔ ایک دن بہت اُداس تھے، آئے تو میں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح ان کا جی بہل جائے معلوم نہیں کیا ہوا کہ وہ یک بیک آبدیدہ ہو گئے! میں نے پوچھا تو بڑے تامّل کے بعد واقعہ سنایا وہی عزیزوں کی دنائت اور شقاوت کا۔ میں نے کہا" ایوب صاحب آپ بددل نہ ہوں، آپ کا کوئی قصور نہیں، قصور ہے تو صرف اتنا کہ آپ خوشحال اور نیک نام کیوں ہیں۔ ہمارے آپ کے اعزا کے دلوں سے نیکی اور فیاضی اٹھالی گئی ہے، اغیار کو تو یہ مسرور اور بافراغت دیکھ کر خوش ہونگے اور فخر کریں گے، لیکن اپنوں کو کھاتا پیتا یا ہنستا بولتا دیکھ کر غم و غصّہ کے انگاروں پر لوٹنے لگیں گے۔ یہ اپنے نکمّے پن اور بے غیرتی کو اپنی بہت بڑی خوبی اور اپنا بہت بڑا حربہ سمجھتے ہیں یہ اپنے کھاتے کماتے عزیز کو غاصب سمجھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آپ نے ان تمام نعمتوں پر قبضۂ مخالفانہ کر رکھا ہے، جو بصورتِ دیگر ان کے قبضہ میں آتیں۔ وہ کبھی نہ دیکھیں گے کہ وہ خود کتنے ناکارہ اور بے ایمان ہیں اور جو فراغت، ناموری اور نیک نامی سے رہا

ہے، اس نے کتنی محنت کی ہے اور اذیت اٹھائی ہے "۔
اور یہ کچھ ہمارے بیشتر رشتہ داروں ہی کا حال نہیں ہے بلکہ اس انفرادی کمزوری اور کمینگی نے پھیل کر جماعتی رنگ اختیار کر لیا ہے۔ جماعتی ہی نہیں بلکہ قومی اور سیاسی بھی۔ سرمایہ و مزدوری کی جنگ اپنی جگہ پر حق بجانب ہے اور جہاں تک اس کے اخلاقی و اقتصادی پہلوؤں کا تعلق ہے اس کے معقول ہونے میں شبہ بھی نہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس اسکیم کو چلانے والے اور اس سے فائدہ اُٹھانے کے درپے بیشتر وہی لوگ ہیں جو نکمے، بر خود غلط اور کینہ پرور ہیں۔ دنیا کے کسی آشوب کا مطالعہ کیجئے۔ آپ کو بالاخر یہی نظر آئے گا کہ معقول نظام یا تحریک نامعقولوں کے ہاتھ میں تھی۔ آپ ہی سوچئے کیا مزدور اور کاریگر کے علاوہ کوئی اور طبقہ اس دنیا میں قابلِ عزت و لحاظ نہیں ہے۔ دنیا کی نجات دولت کی مساوی تقسیم پر نہیں ہے بلکہ محنت اور قابلیت کے صحیح احساس و تنظیم پر ہے۔ میں آجکل بازیگروں کے اصولِ تقسیم کا بالکل قائل نہیں جس سے " دولت " ان کے ہاتھ میں جائے اور " مساوی " میرے ہاتھ میں رہ جائے!
آخر میں میں نے ان سے کہا " ایوب صاحب اپنا کام کئے جائیے! دولت و شہرت کا حساب عزیزوں کو نہیں اللہ کو دیا جائے گا۔ البتہ آپ اس کے لئے تیار رہئے کہ جتنا اللہ آپ کو کارگزار، فارغ البال، نیک نام اور بھلا مانس بنائے گا، اتنا ہی شیطنت آپ کی دشمن بنتی جائے گی "۔
مرحوم اپنے جن بزرگوں یا دوستوں کو عزیز رکھتے تھے انھیں میرے ہاں ضرور لاتے اور مجھ سے ملا کر بہت خوش ہوتے۔ پھر بڑا اصرار کرتے کہ میں اُن سے اُن کے گھر یا جائے قیام پر جا کر مل آؤں۔ یہی نہیں بلکہ جس کسی کو تکلیف یا مصیبت میں

دیکھتے یا اس کے ہاں خوشی کی کوئی بات ہوتی تو مجھے خبر کرنے کہ میں وہاں ہو آؤں میں ایسا کر دیتا تو ان پر مسرت و شکر گذاری کا عجیب عالم طاری ہوتا۔ ظاہر ہے اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ میری اس بھلمنساہٹ کی لوگ قدر کریں لیکن یہ بات یہیں نہیں ختم ہو جاتی واقعہ یہ ہے کہ جس شخص یا بات سے انھیں تقویت یا مسرت پہنچتی تھی اس میں وہ مجھے بھی شریک کر لینا چاہتے تھے۔ دوسرے یہ کہ میں نے ان کے انتخاب کو پسند کر لیا تو اس پر اسناد کی مہر لگ گئی تیسرے یہ کہ انھوں نے جس کو مجھ سے ملایا اس کے ساتھ بہت بڑا سلوک یہ کیا کہ مجھ ایسے (بزعم خود) معقول آدمی سے ایسے متعارف کیا۔ بظاہر یہ باتیں دور از کار اور خود میرے برخود غلط ہونے پر دال ہیں۔ اور اپنے منہ سے ان کا تذکرہ کرنا میرے لئے بڑی بھدّی بات ہے لیکن میں مرحوم کی بعض تحت شعوری سرگرمیوں سے واقف ہوں انکا مقصد وہی تھا جو میں نے بیان کیا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک لطیفہ سنیئے:۔ ایک دن بڑے اصرار سے کہنے لگے کہ "رشید صاحب پتلون پہنا کیجئے"۔ میں نے کہا "آخر کیوں؟" کہنے لگے "ہرج ہی کیا ہے!" میں نے بڑے تعجب سے پوچھا "آخر اس فرمائش کی تُک کیا ہے؟" کہنے لگے "جی چاہنے میں تُک کو کیا دخل" میرے ان کے ایک بے تکلف دوست بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے یہ رد و قدح سنی تو معاملہ کی نوعیت دریافت کرنے لگے میں نے بتایا تو اچھل پڑے۔ کہنے لگے "رشید صاحب قیامت تک نہ پہنیئے گا۔ اس نے ایک پتلون سلوائی ہے۔ اسے پہننا چاہتا ہے۔ آپ سے ڈرتا ہے اس کی باتوں میں نہ آئیے گا۔ دیکھوں تو کس طرح پہنتا ہے"۔

یونیورسٹی سے ایک قطعہ زمین مکان بنانے کے لئے میں نے پٹّہ پر لی تھی۔

یہ ایوب کے مکان سے متصل تھی۔ برسوں میرے پاس افتادہ پڑی رہی۔ مرحوم کا مسلسل اصرار رہا کہ "رشید صاحب مکان بنوا لیجئے۔ ہر شخص بنوا رہا ہے آخر آپ کیوں نہ بنوائیں۔ تھوڑا سا حصہ چھوڑ دیجئے گا۔ اس میں میں ایک جھونپڑا ڈال لونگا۔ مویشی پال لوں گا۔ مرغیاں رکھونگا اور کھیتی کیا کروں گا"۔ میں نے کہا "میں مکان نہ بنواؤں گا ساری زمین آپ کی ہے جو چاہے کیجئے۔ مجھے تو یہ دیکھنا ہے کہ آپ سے کچھ ہوتا ہے یا نہیں"۔ کہنے لگے "جی نہیں آپ مکان بنوائیے۔ میرا بڑا جی چاہتا ہے کہ یہاں آپ کا مکان ہو۔ آپ تمام روپیہ خرافات میں اٹھاتے ہیں مکان ہو گا تو ایک چیز ہو جائے گی۔ آپ قریب ہو جائیں گے وسیع عالیشان مکان' میں سمجھوں گا میرا ہی مکان ہے۔ جب چاہونگا چلا جایا کروں گا۔ ایک ٹھکانہ ہو جائے گا"۔

مکان بنا، لیکن ایوب کا ارمان پورا نہ ہوا۔ اب وہ اور ان کا ارمان دونوں یونیورسٹی کے گورستان میں آسودۂ راحت ہیں۔ یہاں پہنچ کر مجھے اپنا چھوٹا چچا زاد بھائی جوانمرگ رفیق یاد آ گیا جس نے بارہ تیرہ سال تک' مرتے دم تک مجھ پر اور میرے بیوی بچوں پر اپنی روشن و رنگین زندگی کی وہ تمام متاع نثار کر دی جس کی قیمت اس دنیا میں آج تک کوئی نہیں لگا سکا! آہ! کیا نثار ہونا اور کس کس طرح نثار ہونا! جس نے تمام عمر یہ خیال دل میں نہ آنے دیا کہ اپنی استعداد سے اپنے آپکو بھی کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچنا چاہئے۔ بلکہ اسی کا قائل رہا اور اسی پر مرمٹا کہ اس کی نعمت اور اس کی ہر متاع میرے اور میرے بیوی بچوں ہی کو راحت و فائدہ پہنچانے کے لئے تھی۔

بہادر اور باوفا رفیق بھی مکان کا ارمان اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ میں اپنا

مکان دیکھ کر مسرور و مطمئن ضرور ہوتا ہوں لیکن جب رفیق اور ایوب یاد آتے ہیں تو دل بے اختیار ہو کر ناممکنات کی آرزو کرنے لگتا ہے۔ یعنی کاش دونوں زندہ ہو جاتے اور میں انھیں اسی مکان میں گلے لگاتا۔ ان کا خوش ہونا اور دھوم مچانا دیکھتا اور مطمئن ہو جاتا کہ میں نے بھی کچھ کام کیا!

سردی کا زور اور دوستوں کا مجمع تھا۔ ہم سب ڈاکٹر عبادالرحمٰن خاں کے ہاں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے کہ ایّوب مرحوم نے کہا "سردی لگ رہی ہے"، کسی نے توجہ نہ کی۔ تھوڑی ہی دیر بعد کسی قدر بے قرار ہو کر کہا "بڑی سردی ہے رشید صاحب میں چلا"۔ ڈاکٹر عباد نے کہا "نہ ٹھکانے سے کھاتے ہو نہ شریفوں کی طرح رہتے ہو سردی کیوں نہ لگے"، یہ کہہ کر اندر سے اپنا اونی گرم اوورکوٹ لائے اور مرحوم کو اچھی طرح اڑھا دیا۔ چائے منگائی اور پلائی۔ اس کے بعد بھی مرحوم نے کہا "رشید صاحب میں چلا"، میں ان کے لہجہ سے اور ان کے چہرہ کی طرف دیکھ کر چونکا۔ کھیل ختم کر دیا گیا اور ہم سب انھیں اوڑھا ڈھکا کر ان کے مکان پر پہنچا آئے۔ صبح سے بخار نے زور پکڑا۔ لاکھ لاکھ جتن کئے مگر کمزوری بڑھتی ہی گئی دوستوں کی تشویش بڑھی۔ مایوسی بڑھی اور مرض الموت بڑھا۔ دو تین ہفتہ کے اندر سب کچھ ہو گیا۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ مرض کیا ہے؟ سب نے یہی فیصلہ کیا کہ وقت آپہنچا۔

شام کے قریب نزع کے عالم میں تھے۔ مکان کے باہر یونیورسٹی کے طلباء اور عمائدین کا مجمع تھا۔ لیکن ان سے قریب اور ان میں ملا جُلا ایک اور ہجوم تھا۔ بھنگی، بہشتی، چپراسی، نائی، دھوبی، بیرے، باورچی، خانساماں، خوانچہ والے اور ان میں سے بہتوں کے بیوی بچے خاموش، مایوس سر جھکائے! اور یہ وہ ہجوم

تھا جو کسی مرنے والے کے دروازہ پر جب کہ وہ اس جہان سے گذرنے والا ہو، ہیں نے گذشتہ پچیس سال میں نہیں دیکھا تھا۔

مرحوم کو سپرد خاک کیا گیا۔ مولانا ابوبکر صاحب نے قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر فرمایا:۔

"بھائیو! ایوب اپنے پیدا کرنے والے کے ہاں پہنچ گئے اگر ان سے تم کو کوئی تکلیف پہنچی ہو تو معاف کر دینا"

گریہ سب کے گلوگیر ہوا، کسی نے روکا اور کسی سے نہ رکا!۔

ایک غم نصیب کے قلب کی گہرائیوں سے ایک اور دردناک صدا بلند ہوئی "کیا یہاں کوئی ایسا بھی موجود ہے جس پر ایوب کی خدمات کا صلہ واجب الادا نہ ہو" اس آواز کو سنا کسی نے نہیں محسوس سب نے کیا۔

رشید احمد صدیقی

سروجنی نائیڈو
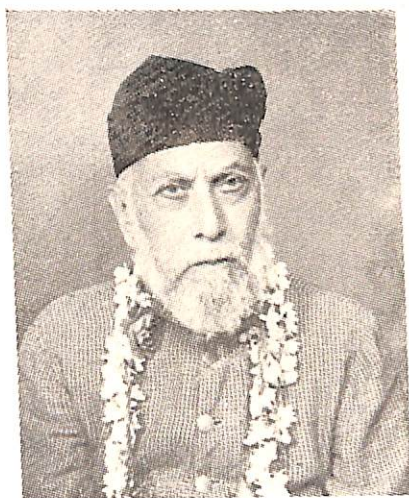
آغا حیدر حسن دہلوی

آغا حیدر حسن دہلوی

آغا حیدر حسن دہلوی اردو کے ان برگزیدہ ادیبوں میں سے ایک ہیں۔ جنہوں نے قلعہ کے بعد قلعے کی تہذیب اور دِلّی کی ٹکسالی زبان کے چراغ کو روشن رکھا ہے۔ آغا صاحب کو عورتوں کی روزمرہ گفتگو لکھنے میں یدِطولیٰ حاصل ہے۔ ان میں دِلّی کی خالص بیگماتی زبان کا دلنشین لب و لہجہ، محاورے تشبیہات اور گفتگو کا چٹخارا سب کچھ موجود ہے۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں بات چیت کے انداز میں لکھتے ہیں ان کی تحریروں میں روانی، تسلسل اور جاذبیت کی کمی نہیں ہوتی۔ ان کی نثر برجستگی کی صفت اور محاورات کے حسن سے مالا مال ہوتی ہے۔ اور اس اعتبار سے وہ اپنے تمام ہمعصروں میں ایک ممتاز و منفرد درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی باتیں سنئے یا پڑھئے قلعہ کی بیگمات کی گفتگو کا مزا آتا ہے۔ وہ اکثر ایسے محاورے بھی بولتے ہیں جن کا سمجھنا قدیم دِلّی والوں کے بھی بس کی بات نہیں یہ آغا صاحب

کا عظیم ترین کارنامہ اور اردو زبان میں بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے قلعہ کے محاورات اور زبان کے ورثہ کو آج تک محفوظ رکھا۔

آپ آجکل حیدرآباد (دکن) میں مقیم ہیں۔

بیگم نیڈو

اب جلسہ کی جان روحِ رواں سروجنی کی بابت سنو۔ ٹھمکا ٹھمکا بوٹا سا قد، گول گول گدرایا ہوا ڈیل، کھلتی ہوئی چمپئی رنگت، کتابی چہرہ، کھڑا کھڑا نقشہ، چہرے سے متانت اور سنجیدگی ہویدا ہے مگر ساتھ ہی اس کے خوش خلق اور ہنس مکھ بھی ضرور ہیں۔ خوب خوب گہری گہری کالی کالی جیتی بھوئیں، جٹ کے اوپر چھوٹا سا، خوب گہرا سرخ کسدم کا ٹیکہ، بڑی بڑی نرگسی آنکھیں کچھ جھکی جھکی سی۔ دیکھنے میں کمزور مگر چلنے اور حرکت کرنے میں ہوا سے باتیں کریں۔ آنکھوں کے ڈھیلے ہر وقت تر و تازہ رہتے ہیں۔ پتُلیاں خوب سیاہ اور بڑی بڑی جن کی چاروں طرف بڑے بڑے مڑے ہوئے سیاہ گنجان پلکوں کا جنگلہ ہے۔ جس میں یہ وحشی ہر وقت رم کرتے رہتے ہیں۔ بھلا کہیں اس جنگلے سے یہ کالے شیرازی کبوتر رُکتے ہیں، نہیں آناً فاناً میں دور دور کے کاوے کاٹ آتے ہیں۔ بوا، آنکھیں کیا بتاؤں، غضب کی ہیں۔ موتی کوٹ کوٹ کر بھر دیئے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ان سے حجاب و شرم و حیا اور عصمت و عفت پڑی برستی ہے۔ یہ دیکھ لو کہ شہر شہر ملک ملک اکیلی پڑی پھرتی ہیں۔ ہزاروں لاکھوں مردوں میں اٹھتی بیٹھتی ہیں،

چاہیئے تھا کہ دیدے کا پانی ڈھل جاتا مگر نہیں! آنکھ میں وہ حیا ہے کہ بعض بے حیا
مردوں کی طرف اٹھتے ہی ان کو بھی حیادار بنا دیتی ہے۔ یہ باہر کا پھرنا اس سے ہزار درجہ
بہتر ہے کہ گھروں کی چار دیواری کے اندر پڑے پڑے پردوں میں گردے لگائیں اور نہ
بیوی ہم نے حاشا اللہ حاشا الرحمٰن کوئی ان کی ایسی ویسی بات سنی۔ متناسب اعضاء
ہیں، چھپ تختی بڑی پیاری ہے جس کے سبب جامہ زیبی اور بھبن غضب کی ہے
کان موزوں ہیں اور لویں نیچے کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ جھکی ہیں۔ بال بڑے
گھندار کالے بھونرا سے ہیں اور انگریزی موجودہ طرز کے موافق کنپٹیوں پر جھکا کر اور
کانوں پر سے لے جا کر پیچھے جوڑے کی صورت میں لپیٹ دیکر کالی کنگھیاں لگائی
گئی تھیں جن میں ہیرے کی طرح چمکتے ہوئے سفید نگ جڑے ہوئے تھے جو ہمیں
بنارسی ساڑی کے اندر سے پٹ بیجنوں کی طرح جھم جھم کر رہے تھے۔ بالوں کی وضع تھی
تو انگریزی مگر ہماری محمد شاہی پٹیوں اور سادی بیریوں سے کچھ کچھ ملتی جلتی ہے۔
بائیں رخسار پر ذرا کچھ اوپر ہٹ کر ایک ننھا سا ہلکے سیاہ رنگ کا تل ہے کہ جب
ہنستے وقت گال اوپر کی طرف بڑی خوبصورتی سے تلاطم پیدا کرتے ہوئے چڑھتے ہیں
تو شامت زدہ آنکھوں میں گھسنے کی کوشش کرتا ہے۔ سیدھے رخسار میں ہلکا سا
گڑھا پڑتا ہے۔ جس کی بابت دِلّی والیوں کا خیال ہے کہ ساس پر بھاری ہوتا ہے۔
چوکھٹا موزوں، برابر برابر جمی ہوئی خوب چمکتی ہوئی بتیسی جیسے بحرین کے موتی، ہونٹ
جو ہنسنے اور مسکرانے میں ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں اور پھر کچھ وقفہ کے
بعد مل کر بالکل وابستہ ہو جاتے ہیں۔ پتہ دیتے ہیں کہ یہ عورت بڑی برداشت
اور تحمل کی ہے۔ رکھ رکھاؤ اور اپنے تئیں لئے دیئے رکھنے کا بڑا مادّہ ہے۔ کوئی

راز کی بات کہدو تو گویا کوئیں میں ڈال دی یا یوں سمجھ لو کہ وہ زبان حال سے کہتے ہیں کہ ہم نے آج تک کوئی چھچھوری، پوچ، بیہودہ، اور لغوبات اپنی میں سے باہر نہیں جانے دی۔ پہلے ہم ساکنانِ دل ودماغ کا جھاڑا لیتے ہیں پھر نکلنے دیتے ہیں، خوبصورت تھوڑی جیسے بنارسی لنگڑے کی کیری، مورنی کی سی گردن، گول سڈول بازو، چلتی لمبوتری سانچے میں ڈھلی باہیں، اچھی گول گول نازک کلائیاں، جن میں پھنسی پھنسی چمکتے ہوئے زبرجدی رنگ کی جاپانی ریشمین چوڑیاں۔ بیچ میں نیم کے پھول کی بمبئی کی جلاؤ اشرفی کے سونے والی چوڑی، اور پھر ریشمین چوڑیوں میں ملی ہوئی اِدھر اُدھر ایک کے بعد ایک، بائیں کے وُروالی وہی سرخی لئے اشرفی کے سونے کی پتلی پتلی تخیں بڑی بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ گلے میں ست لڑے کی سی وضع کی کنٹھی تھی جس میں جگنی کی جگہ یاقوت کی آوازدار جڑائی کا چاند اور پکھراج کی جڑائی کا تارہ سا لگا ہوا تھا۔ کانوں میں ہیرے کے چھوٹے چھوٹے بندے تھے جو بجلی کی روشنی میں حرکت کیساتھ بڑے جھم جھم کرتے تھے۔

کنارے دار ہلکے موتیائی رنگ کی بنارسی ساڑھی۔ کنارے پر دھنئے کی بیل اور متن پر برف کی بوٹیاں پڑی تھیں۔ چولی مرہٹی تراش کی تھی جس کی آستینیں خوب پھنسی پھنسی آدھے بازوؤں تک تھیں۔ چولی کا کپڑا بنارسی تھا جس کی زمین پہ پاس پاس گلاب اور دھوے کی سنہری بوٹیاں پڑی تھیں اور اس پہ کنارہ جو لگا یا تھا وہ بھی بنارسی، جس کی بیل خدا جانے کس قسم کے جال کی تھی لیکن چولی کا رنگ اور ٹکائی ساڑھی ہی کے جواب کی تھیں۔ ساڑھی بمبئی کے طرز سے بندھی تھی۔ چاروں طرف خوب اچھا ٹھاٹھا جھول دیا ہوا تھا۔ لیکن اوڑھنے کا سرا معمولی ساڑھیوں سے بڑا تھا۔ جس کے آنچل کو الٹے ہوے پر مہین مہین چنٹ دیکر اور پھول سوئی ٹانکے

سر پر سے لیجا کر پیچھے نیچے تک لٹکتا چھوڑ دیا تھا۔ جس سے پچھائے کی ڈھکن بڑی خوبی سے ہوگئی ہے۔ اور بمبئی کی عام ساڑھیاں جو پارسنیں باندھتی ہیں کہ پلّو کا ایک سرا لیکر دائیں پہلو کی لپیٹ کے بعد گائی کے نیچے سے بائیں پہلو کی طرف اڑس لیتی ہیں اور دوسرا سرا پیچھے سموسے نما لٹکا رہنے دیتی ہیں۔ اس میں وہ بات نہ رہی تھی۔ (یعنی پیچھے سموسے کی طرح نہیں لٹکتا تھا) بلکہ دونوں سرے پیچھے ہی لٹکے ہوئے تھے۔ کان کے پاس کچھ سرگاہ کے آنچل کی جھونک تھی۔ جس کو سروجنی صاحبہ اکثر بولتے وقت عجیب انداز سے دائیں کان اور ہنسلی کا سرا ڈھانکنے کے لئے بڑی پھرتی سے جھکا لیتی تھیں۔ جو پھیر حرکت سے آہستہ آہستہ کھسک کر پیچھے ہٹ جاتا تھا اور پھر وہ چٹکی سے پکڑ کر آگے کھسکا لیتی تھیں۔ پاؤں میں ہیرے سے اونچی ایڑی کی سیاہ بیگمی جوتی تھی۔ جس وقت یہ تقریر کرنے کھڑی ہوئی ہیں اس وقت کا عالم بیان سے باہر ہے آواز میں ایک خاص قسم کی لرزش تھی جو دلوں میں لرزش پیدا کرتی تھی۔ کبھی تو آواز رساں رساں اوپر چڑھ کر جہاوٹ کے بھورے بھورے بادلوں کی سی گرج پیدا کرتی تھی اور کبھی آہستہ آہستہ نیچے ہو کر ساون بھادوں کی باجرا پھوار کا مزہ دیتی تھی اور کبھی ایک جگہ قائم ہو کر سننے والوں کے دلوں کی متحرک موجوں میں چاند کے غیر مستقل عکس کا مزہ دیجاتی تھی۔ یا یہ معلوم ہوتا تھا کہ گل مشکی کے تختے میں سونے موتیوں کا ہزارہ چھوٹ رہا ہے۔ جس کی صدہا پتلی پتلی دھاریں لب کے پاس ایک دوسرے سے بہت ہی قریب قریب ملی ہوئی نکل کر اور اوپر پھیلتی ہوئی اور ایک دوسرے سے دور ہوتی ہوئی اور پھر ایک خاص قسم کی محراب بنا کر پھولوں کی نازک نازک کالی پنکھڑیوں پر گر کے اور تھوڑی دیر ٹھہر کر اور اپنی چمک دکھا کے چھوٹے چھوٹے موتیوں کی ٹوٹی

ہوئی لڑیوں کی طرح تختے میں چاروں طرف بکھر جاتی ہوں۔ جس وقت وہ جوش میں آنکر
سرکو حرکت دیکے گردن کو اکڑاتی تھیں تو معلوم ہوتا تھا کہ بارش سے دُھلے ہوئے ہرے
گنجن سے جنگل میں ہرنی ہوا کے رخ کھڑی کستوری کی بولے رہی ہے۔ لفظوں کو پُر زور
اور پُر اثر بنانے کے لئے جب وہ مُٹھیاں بھینچ کے اور ہاتھ ڈھیلے چھوڑ کے پھر جو اکڑاتی
تھیں اور جھومتی تھیں تو معلوم ہوتا تھا کہ سطح آب پر کنول کی تیرتی ہوئی بیلوں میں
جل پری راج ہنسوں کے ساتھ کھڑی اٹھکھیلیاں کر رہی ہے۔ پھر خاتمۂ تقریر کے
بعد ان کا ایک دم فوراً ہی بیٹھ جانا اور دیوان میں تالیوں کا شور اور حاضرین کی جزغم
جزغم بالکل جل پری کے کھیلتے کھیلتے دفعتاً غوطہ لگا جانے اور جل کوؤں کے شور و غل کے
مانند تھا۔ یا ان کا جھومنا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی ہری ہری دوب کے جنگل میں چاندنی
چٹک رہی ہے اور ہوا کے جھونکے سے ہلتے ہوئے پتوں کی اوٹ میں پٹ بیجنوں کی
کی چاندنی کے سامنے مدھم مدھم چمک میں ایک دور کسی چٹان پر بیٹھے ہوئے گڈریئے
کی بین کی آواز پر کیچلی پھاڑ کر نئی نکلی ہوئی ناگن کا پھن پھیلا کر کھیلنے یا کسی گاؤں سے
رات کے سناٹے میں پونگی کی آنے والی لہر پر لہرا لینے کی مانند تھا اور پھر بولتے بولتے
آناً فاناً میں کچھ جسم کو ڈھیلا چھوڑ کے کرسی جو جگہ کی تنگی کی وجہ سے پیچھے ہٹائی گئی تھی
تاکہ انھیں کھڑے ہونے میں سہولت ہو اور اس کا ہٹا یا جانا انھیں یاد نہ رہا ایک
پاس ہی پڑی ہوئی چوکی پہ بیٹھ جانا۔ لہرا بند ہونے پر ناگن کے پھن سکیڑ کے پتوں پہ
سے اوس چاٹنے کی طرح تھا۔

اور ہاں جب ہمارے کالج کے مشہور شاعر سہیل صاحب نے فارسی کا قصیدہ
پڑھا ہے اس وقت بیگم نیڈو کی پتلی پتلی انگلیاں خود بخود تال سم کے ساتھ کرسی پر جس

پردہ بیٹھی تھیں پڑنے لگیں۔ ایک تو قصیدے کے الفاظ ایسے تھے کہ جن کے ادا کرنے میں خود بخود ایک راگ کی سہانی آواز نکلتی تھی۔ پھر لفظ بڑے فصیح شان شوکت کے بندش انوری اور خاقانی کی بندش سے پالا جمائے سونے پہ سہاگہ سروجنی صاحبہ کی انگلیوں کی حرکت نے غضب کا سماں باندھ دیا۔

اے ہاں ایک بات اور یاد آئی جس وقت سروجنی صاحبہ بول رہی تھیں۔ تقریر تھی ساری انگریزی میں۔ اور انگریزی وہ زوردار کہ خود انگریز منہ تکیں۔ کہ یا اللہ کوئی رحمت کا فرشتہ ہے یا آزادی کا، کہ کھڑا بول رہا ہے۔ سارے لوگوں پہ وہ سنّاٹا جیسے اگن چھکے اور سارے پرند چپکے ہو کر بیٹھ رہیں میں نے اپنے دل میں کہا کہ چل تو نے تو کئی دفعہ سنا ہے آج اور سننے والوں کا تماشا دیکھ۔ اب میں نے لوگوں کی طرف آنکھیں دوڑائیں۔ کسی کی تو آنکھیں پھٹی رہ گئی تھیں اور کسی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ ایک انگریز ذرا موٹا سا سرخ سرخ لال لال چقندر سا رنگ، زرد زرد، دانت نکوسے۔ منہ پھاڑے ایسا مبہوت ہو کے بیٹھا تھا کہ معلوم ہوتا تھا دشمنوں کو سانپ سونگھ گیا۔ اے ہے کچھ عجیب ہی بے چارے کی صورت بن کے رہ گئی تھی کہ دیکھے سے ہنسی آتی تھی۔

آغا حیدر حسن دہلوی

عظیم بیگ چغتائی

عصمت چغتائی

عصمت چغتائی

دنیائے ادب میں عصمت چغتائی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ آپ کا شمار صفِ اوّل کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ آپ کی کہانیوں کے چار مجموعے اور تین ناول شائع ہو چکے ہیں۔ بیشتر کہانیوں کے ترجمے ہندوستان کی متعدد زبانوں کے علاوہ انگریزی، روسی، چیک اور جرمنی زبانوں بھی ہوئے ہیں۔

آپ ۱۹۱۵ء میں آگرہ میں پیدا ہوئیں، لکھنؤ اور علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔ قرآن و حدیث کا مطالعہ گھر پر کیا۔ شروع شروع میں انگریزی ادب سے استفادہ کیا، خصوصاً ہارڈی کی ناول نگاری اور برنارڈ شاہ کی تحریروں سے شعوری طور پر اکتساب کی کوشش بھی کی۔ آپ نے اپنا ڈرامہ "فسادی" برنارڈ شاہ سے حد درجہ متاثر ہو کر لکھا۔

ہندوستانی عورت کی مغموم اور ماتمی زندگی سے انہیں ہمیشہ سے چڑ رہی

وجہ ہے کہ جرأت اور بے باکی جو ان کی طبیعت کی امتیازی صفت ہے ان کی تحریروں میں بھی بدرجۂ اتم دکھائی دیتی ہے۔ عصمت چغتائی کی دُور رس اور باریک بین نگاہ انسانی فطرت کے ہر ہر پہلو کا بڑی دلچسپی سے مشاہدہ کرتی ہیں اور ذہن کے تمام نہاں خانوں میں جھانکنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ مشاہدہ کی اس غیر معمولی قوّت اور فکر کے عمق نے ان کی تحریروں میں بڑی جاذبیت پیدا کر دی ہے۔

عصمت چغتائی کا قلم لاگ، لپیٹ، مروّت اور مصلحت سے آزاد ہے۔ وہ اپنی کہانیوں اور خاکوں میں صداقت کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتیں "بچھو پھوپی" اور "دوزخی" میرے اس دعوے کی دلیل ہیں۔ آپ زبان شستہ، سائستہ، اور بامحاورہ لکھتی ہیں۔ وہ ایک عورت ہیں اور انھوں نے کم از کم زبان کے معاملے اپنی اس حیثیت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔

آجکل بمبئی میں مقیم ہیں۔

دوزخی

جب تک کالج سر پہ سوار رہا پڑھنے لکھنے سے فرصت ہی نہ ملی جو ادب کی
طرف توجہ کی جاتی اور کالج سے نکل کر بس دل میں یہی بات بیٹھ گئی کہ ہر وہ چیز جو
دو سال پہلے لکھی گئی بوسیدہ، بدمذاق اور جھوٹی ہے۔ نیا ادب صرف آج اور کل
میں ملے گا۔ اس نئے ادب نے اس قدر گڑ بڑا یا کہ نہ جانے کتنی کتابیں صرف نام دیکھ
کر ہی واہیات سمجھ کر پھینک دیں اور سب سے زیادہ بیکار کتابیں جو نظر آئیں وہ
عظیم بیگ چغتائی کی تھیں "گھر کی مرغی دال برابر" والا مضمون۔ گھر کے ہر کونے میں ان
کی کتابیں رُلتی پھرتیں۔ مگر سوائے اماں اور دو ایک پرانے فیشن کی بھابیوں کے کسی
نے اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ یہی خیال ہوتا بھلا ان میں ہوگا ہی کیا؟ یہ ادب نہیں پھکڑ،
مذاق، پرانے عشق کے سٹریل قصے اور جی جلانے والی باتیں ہونگی یعنی بے پڑھے
رائے قائم۔ مجھے خود یقین نہیں آیا کہ میں نے عظیم بھائی کی کتابیں کیوں نہ پڑھیں۔
شاید اس میں تھوڑا سا غرور بھی شامل تھا اور خودستائی بھی۔ یہ خیال ہوتا تھا یہ
پرانے ہیں ہم نئے۔

ایک دن یونہی لیٹے لیٹے ان کا ایک مضمون "یکہ" نظر آیا۔ میں اور رحیم پڑھنے لگے۔ نہ جانے کس دھن میں تھے کہ ہنسی آنے لگی اور اس قدر آئی کہ پڑھنا دشوار ہو گیا۔ ہم پڑھ ہی رہے تھے کہ عظیم بھائی آگئے اور اپنی کتاب پڑھتے دیکھ کر کھل گئے۔ مگر ہم جیسے چڑ گئے اور منہ بنانے لگے۔ وہ ایک ہوشیار تھے بولے "لاؤ میں تمہیں سناؤں" اور یہ کہہ کر دو ایک مضمون جو ہمیں سنائے تو صحیح معنوں میں ہم زمین پر لوٹنے لگے۔ ساری بناوٹ غائب ہو گئی۔ ایک تو ان کے مضمون اور پھر انہی کی زبانی۔ معلوم ہوتا تھا ہنسی کی چنگاریاں اڑ رہی ہیں جب وہ خوب احمق بنا چکے تو بولے:۔

"تم لوگ تو کہتے ہو میرے مضمونوں میں کچھ نہیں ...." اور انھوں نے چھیڑا ہمارے منہ اتر کر ذرا ذرا سے نکل آئے اور بے طرح چڑ گئے۔ جھنجلا کر الٹی سیدھی باتیں کرنے لگے۔ جی جل گیا اور پھر اس کے بعد اور بھی ان کی کتابوں سے نفرت ہو گئی۔

میں نے ان کے مضامین کی ان کی زندگی میں کبھی تعریف نہ کی۔ حالانکہ وہ میرے مضمون دیکھ کر ایسے خوش ہوتے تھے کہ بیان نہیں۔ اس قدر پیار سے تعریف کرتے تھے مگر یہاں تو ان کی ہر بات سے چڑنے کی عادت تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ وہ میرا مذاق اڑاتے ہیں اور بخدا وہ شخص جب کسی کا مذاق اڑاتا تھا تو جی چاہتا تھا بچوں کی طرح زمین پر مچل جائیں اور روئیں۔ کس قدر طنز، کیسی کڑوی مسکراہٹ اور کٹیلے ہوئے جملے، میں تو ہر وقت ڈرتی تھی کہ میرا مذاق اڑایا اور میں نے بد زبانی کی۔

کبھی کہتے تھے کہ "مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں تم مجھ سے اچھا نہ لکھنے لگو۔" اور میں نے صرف چند مضمون لکھے تھے اس لئے جی جلتا تھا کہ یہ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔

ان کے انتقال کے بعد نہ جانے کیوں مرنے والے کی چیزیں پیاری ہو گئیں

ان کا ایک ایک لفظ چبھنے لگا اور میں نے عمر میں پہلی دفعہ ان کی کتابیں دل لگا کر پڑھیں دل لگا کر پڑھنے کی بھی خوب رہی۔ گویا دل لگانے کی بھی ضرورت تھی! دل خود بخود کھنچنے لگا۔ افوہ! تو یہ کچھ لکھا ہے ان کی رُلنے والی کتابوں میں۔ ایک ایک لفظ پر ان کی تصویر آنکھوں میں کھنچ جاتی ہے اور پل بھر میں وہ غم اور دکھ میں ڈوبی ہوئی مسکرانے کی کوشش کرتی ہوئی آنکھیں وہ اندوہناک سیاہ گھٹاؤں کی طرح مرجھائے ہوئے چہرے پر پڑے ہوئے گھنے بال، وہ پیلی نیلاہٹ لئے ہوئے بلند پیشانی، پژمردہ اودے ہونٹ۔ جن کے اندر قبل از وقت توڑے ہوئے ناہموار دانت اور لاغر سوکھے سوکھے ہاتھ اور عورتوں جیسے نازک، دواؤں میں بسی ہوئی لمبی انگلیوں والے ہاتھ اور پھر ان ہاتھوں پر ورم آگیا تھا۔ پتلی پتلی کھپچی جیسی ٹانگیں جن کے سر پر ورم جیسے سوجے ہوئے بدوضع پیر جن کے دیکھنے کے ڈر کی وجہ سے ہم لوگ ان کے سرہانے ہی کی طرف جایا کرتے تھے اور سوکھے ہوئے پنجرے جیسے سینے پر دھونکنی کا شبہ ہوتا تھا۔ کلیجے پر ہزاروں کپڑوں بنیانوں کی تہیں اور اس سینے میں ایسا پھڑکتا ہوا چلبلا دل! یا اللہ یہ شخص کیونکر ہنستا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کوئی بھوت ہے یا جن جو ہر خدائی طاقت سے کشتی لڑ رہا ہے۔ نہیں مانتا مسکرائے جاتا ہے۔ خدا جبّار و قہار چڑھ چڑھ کر کھانسی اور دمہ کا عذاب نازل کر رہا ہے اور یہ دِل ہے کہ قہقہے نہیں چھوڑتا۔ کون سا دنیا و دین کا دکھ تھا جو قدرت نے بچا رکھا تھا مگر پھر بھی نہ رُلا سکا۔ اس دکھ میں جلن، ہنستے نہیں ہنساتے رہنا کسی انسان کا کام نہیں۔ ماموں کہتے تھے "زندہ لاش،، خدایا اگر لاشیں بھی اس قدر جان دار، بے چین اور پھڑکنے والی ہوتی ہیں تو پھر دنیا ایک لاش کیوں نہیں بن جاتی۔

میں ایک بہن کی حیثیت سے نہیں ایک عورت بن کر ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتی تو دل لرز اٹھتا تھا۔ کس قدر ڈھیٹ تھا ان کا دل! اس میں کتنی جان تھی منہ پر گوشت نام کو نہ تھا۔ مگر کچھ دن پہلے چہرے پر ورم آجانے سے چہرہ خوبصورت ہو گیا تھا کنپٹیاں بھر گئی تھیں۔ پچکے ہوئے گال دبیز ہو گئے تھے۔ ایک موت کی سی جلا چہرہ پر آ گئی تھی اور رنگت میں کچھ عجیب طلسمی سبزی سی آگئی تھی۔ جیسے حنوط کی ہوئی ممی! مگر آنکھیں معلوم ہوتا تھا کسی بچّے کی شریر آنکھیں جو ذرا سی بات پر ناچ اٹھتی تھیں اور پھر کبھی ان میں نوجوان لڑکوں کی سی شوخی جاگ اٹھتی تھی اور یہی آنکھیں کبھی دورے کی شدّت سے گھبرا کر چیخ اٹھتیں۔ ان کی صاف شفّاف نیلی سطح گدلی زرد ہو جاتی اور بیکس ہاتھ لرزنے لگتے۔ سینہ پھٹنے پر آجاتا۔ دورہ ختم ہوا کہ پھر وہی روشنی، پھر وہی رقص، پھر وہی چمک۔

ابھی چند دن ہوئے میں نے پہلی مرتبہ "خانم" پڑھی۔ ہیرو وہ خود نہیں، ان میں اتنی جان ہی کب تھی مگر وہ ہیرو ان کے تخیل کا ہیرو ہے۔ وہ ان کے دبے ہوئے جذبات کا تخیلی مجسمہ ہے۔ جیسے ایک لنگڑا خوابوں میں خود کو ناچتا، کودتا، دوڑتا ہوا دیکھتا ہے ایسے ہی وہ مرض میں گرفتار نڈھال پڑے اپنے ہمزاد کو شرارتیں کرتا دیکھتے تھے۔ کاش ایک دفعہ اور صرف ایک دفعہ اُن کی "خانم" اس ہیرو کو دیکھ لیتی۔

شاید اوروں کے لئے خانم کچھ بھی نہیں۔ لیکن سوائے لکھنے والے کے اور باقی کے سارے کیرکٹر درست اور زندہ ہیں۔ بھائی صاحب، بھائی جان۔ نانی امّاں، شیخانی، والد صاحب، بھتیجے، بھنگی، بہشتی۔ یہ سب کے سب ہیں اور رہیں گے۔ یہی ہوتا تھا بالکل یہی اور اب بھی سب گھروں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کم از کم میرے گھر میں تو تھا اور ایک

ایک لفظ گھر کی سچّی تصویر ہے۔ جب عظیم بیگ لکھتے تھے تو سارا گھر اور ہم سب ان کے لئے ایکٹنگ کیا کرتے تھے۔ ہم ہلتے جلتے کھلونے تھے اور وہ ایک نقّاش جس نے بالکل اصل کی نقل کر دی۔ جتنی دفعہ "خانم" کو پڑھتی ہوں یہی معلوم ہوتا ہے خاندان کا گروپ دیکھتی ہوں۔ وہ بھابی جان اور خانم جھگڑ رہی ہیں۔ وہ بھائی صاحب شرارتیں ایجاد کر رہے ہیں اور مصنف خود، سر جھکائے خاموش تصویر کشی میں مشغول ہے

"گھر یا بہادر" جس کا پہلا ٹکڑا "رزحِ لطافت" میں چھپا ہے۔ یہ سب تخیلی ہے۔ لاچار و مجبور انسان اپنے ہمزاد سے دنیا جہان کی شرارتیں کروا لیتا ہے وہ خود تو دو قدم نہیں چل سکتا۔ لیکن ہمزاد چوریاں کرتا شرارتیں کرتا ہے۔ خود تو ایک انگلی کا بوجھ نہیں سہار سکتا، مگر ہمزاد جی بھر کر مار کھاتا ہے اور ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ مصنف کو ارمان تھا کہ کاش وہ بھی اتنا مضبوط ہوتا کہ دوسرے بھائیوں کی طرح ڈیڑھ ڈیڑھ سو جوتے کھا کر کمر جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوتا۔ تندرست لوگ کیا جانیں ایک بیمار کے دل میں کیا کیا ارمان ہوتے ہیں۔ پر کٹا پرندہ ویسے نہیں تو خوابوں میں تو دنیا بھر کی سیر کر آتا ہے۔ یہی حال ان کا تھا۔ وہ جو کچھ نہ تھے افسانہ میں وہی بن کر دل کی آگ بجھا لیتے تھے۔ کچھ تو چاہیئے نا جینے کے لئے!

شروع ہی سے روتے دھوتے پیدا ہوئے۔ روئی کے گالوں پہ رکھ کر پالے گئے۔ کمزور دیکھ کر ہر ایک معاف کر دیتا۔ توی ہیکل بھائی سر جھکا کر پٹ لیتے۔ کچھ بھی کریں والد صاحب کمزور جان کر معاف کر دیتے۔ ہر ایک دل جوئی میں لگا رہتا۔ مگر بیمار کو بیمار کہو تو اسے خوشی کب ہوگی؟ ان مہربانیوں سے احساسِ کمزوری اور بڑھتا۔ بغاوت اور بڑھتی۔ غصّہ بڑھتا مگر بے بس۔ سب نے ان کے ساتھ گاندھی جی والی نان وائلنس

شروع کردی تھی۔ وہ چاہتے تھے کوئی تو انھیں بھی انسان سمجھے۔ انھیں بھی کوئی ڈانٹے، انھیں بھی کوئی زندہ لوگوں میں شمار کرے۔ لہذا ایک ترکیب نکالی اور وہ یہ کہ فسادی بن گئے۔ جہاں چاہا دو آدمیوں کو لڑا دیا۔ اللہ نے دماغ دیا تھا اور پھر اس کے ساتھ بلا کا تخیل اور تیز زبان چٹخارے لے لیکر کچھ ایسی ترکیبیں چلتے کہ جھگڑا ضرور ہوتا۔ بہن بھائی، ماں باپ سب کو نفرت ہو گئی۔ اچھا خاصہ گھر میدانِ جنگ بن گیا۔ اور سب مصیبتوں کے ذمہ دار خود۔ بس ساری خود پرستی کے جذبات مطمئن ہو گئے اور کمزور و لاچار، ہر دم کا روگی تھیٹر کا ولین ہیرو بن گیا اور کیا چاہئے؟ ساری کمزوریاں ہتھیار بن گئیں۔ زبان بد سے بدتر ہو گئی۔ دنیا میں ہر کوئی نفرت کرنے لگا۔ صورت سے جی متلانے لگا۔ ہنستے بولتے لوگوں کو دم بھر میں دشمن بنا لینا بائیں ہاتھ کا کام ہو گیا۔

لیکن مقصد یہ تو نہ تھا کہ واقعی دنیا انھیں چھوڑ دے۔ گھر والوں نے جتنا ان سے کھنچنا شروع کیا، اتنا ہی وہ لپٹے۔ آخر میں تو خدا معاف کرے ان کی صورت دیکھ کر نفرت آتی تھی۔ وہ لاکھ کہتے مگر دشمن نظر آتے تھے۔ بیوی شوہر نہ سمجھتی، بچے باپ نہ سمجھتے، بہن نے کہہ دیا تم میرے بھائی نہیں اور بھائی آواز سنکر نفرت سے منہ موڑ لیتے۔ ماں کہتی "سانپ جنا تھا میں نے!"

مرنے سے پہلے قابلِ رحم حالت تھی۔ بہن ہو کر نہیں انسان بن کر کہتی ہوں، جی چاہتا تھا کہ جلدی سے مر چکیں۔ آنکھوں میں دم ہے مگر دل دکھانے سے نہیں چوکتے۔ عذابِ دوزخ بن گئے۔ ہزاروں کہانیوں اور افسانوں کا ہیرو اور ولین بن کر مطمئن ہو چکا تھا وہ چاہتا تھا اب بھی اسے کوئی پیار کرے۔ بیوی پوجا کرے۔ بچے محبت سے دیکھیں، بہنیں واری جائیں اور ماں کلیجہ سے لگائے۔

ماں نے تو واقعی پھر کلیجہ سے لگالیا۔ بھولا بھٹکا راستہ پر آن لگا۔ آخر کو ماں تھی۔ مگر اوروں کے دل سے نفرت نہ گئی۔ یہاں تک کہ پھیپھڑے ختم ہوگئے ورم بڑھ گیا آنکھیں چندھیا گئیں اور اندھوں کی طرح ٹٹولنے پر بھی راستہ نہ ملا۔ ہیرو بن کر بھی ہار ان کی ہی رہی۔ جو چاہا نہ ملا۔ اس کے بدلے نفرت، حقارت، کراہت ملی۔ انسان کس قدر پُرہوس ہوتا ہے۔ اتنی شہرت اور نام ہونے کے باوجود حقارت کی ٹھوکریں کھا کر جان دی۔ صبح چار بجے، آج سے ۴۲ برس پہلے جو ننّھا سا کمزور بچہ پیدا ہوا تھا وہ زندگی کا ناٹک کھیل چکا تھا۔ ۲۰ر اگست کو صبح شمیم نے آکر کہا۔ "منّے بھائی ختم ہورہے ہیں اٹھو۔"

"وہ کبھی ختم نہ ہونگے۔ بیکار مجھے جگا رہے ہو۔" میں نے بگڑ کر صبح کی ٹھنڈی ہوا میں پھر سو جانے کا ارادہ کیا۔

"ارے کمبخت تجھے یاد کر رہے ہیں۔" شمیم نے کچھ پریشان ہو کر ہلایا۔

"ان سے کہدو اب حشر کے دِن ملیں گے —— ارے شمیم وہ کبھی نہیں مر سکتے۔" میں نے وثوق سے کہا۔

مگر جب میں نیچے آئی تو ان کی زبان بند ہو چکی تھی۔ کمرہ سامان سے خالی کر دیا گیا تھا۔ سارا کوڑا کرکٹ، کتابیں ہٹا دی گئی تھیں۔ دوا کی بوتلیں لاچاری کی تصویر بنی لڑھک رہی تھیں۔ دو ننھے بچے پریشان ہو ہو کر دروازے کو تک رہے تھے۔ بھابی انھیں زبردستی چائے پلا رہی تھیں۔ ماں پلنگ کی چادر بدل رہی تھیں سوکھی سوکھی آہیں ان کے کلیجہ سے نکل رہی تھیں۔ آنسو بند تھے۔

"منّے بھائی"، میں نے ان پر جھک کر کہا۔ ایک لمحہ کو آنکھیں اپنے محور پر رُکیں

ہونٹ سکڑے اور پھر وہی نزع کی حالت طاری ہوگئی۔ ہم سب باہر بیٹھ کر چار گھنٹے تک سوکھے بے جان ہاتھوں کی جنگ دیکھتے رہے۔ معلوم ہوتا تھا عزرائیل بھی پست ہو رہے ہیں۔ جنگ تھی کہ ختم ہی نہ ہوتی تھی۔

"ختم ہو گئے منّے بھائی ―" نہ جانے کس نے کہا۔

"وہ کبھی ختم نہیں ہو سکتے" مجھے خیال آیا۔

اور آج میں ان کی کتابیں دیکھ کر کہتی ہوں ناممکن وہ کبھی نہیں مر سکتے۔ ان کی جنگ اب بھی جاری ہے۔ مرنے سے کیا ہوتا ہے۔ میرے لئے تو وہ مر کر ہی جئے اور نہ جانے کتنوں کے لئے وہ مرنے کے بعد پیدا ہونگے، اور برابر پیدا ہوتے رہیں گے، ان کا پیغام "دکھ سے لڑو، نفرت سے لڑو اور مر کر بھی لڑتے رہو" یہ کبھی نہ مر سکے گا۔ ان کی باغیانہ روح کو کوئی نہیں مار سکتا۔ وہ نیک نہیں تھے۔ پارسا نہ ہوتے اگر ان کی صحت اچھی ہوتی وہ جھوٹے تھے۔ ان کی زندگی جھوٹی تھی۔ سب سے بڑا جھوٹ تھی۔ ان کا رونا جھوٹا ہنسنا جھوٹا۔ لوگ کہتے ہیں ماں باپ کو دکھ دیا۔ بیوی کو دکھ دیا۔ بچّوں کو دکھ دیا اور سارے جگ کو دکھ دیا۔ وہ ایک عفریت تھے جو عذاب بن کر دنیا پر نازل ہوئے۔ اور اب دوزخ کے سوا ان کا کہیں ٹھکانا نہیں۔ اگر دوزخ ایسے لوگوں کا ٹھکانا ہے تو ایک بار ضرور اس دوزخ میں جانا پڑے گا۔ صرف یہ دیکھنے کہ جس شخص نے دنیا کی دوزخ میں یوں ہنس ہنس کر تیر کھائے اور تیر اندازوں کو کڑوے تیل میں تلا وہ دوزخ میں عذاب نازل کرنے والوں کو کیا کچھ نہ چڑا چڑا کر ہنس رہا ہوگا۔ بس میں وہ تلخ طنز سے بھری ہنسی دیکھنا چاہتی ہوں جسے دیکھ کر دوزخ کا داروغہ بھی جل اٹھتا ہوگا۔

مجھے یقین ہے وہ اب بھی ہنس رہا ہوگا۔ کیڑے اس کی کھال کو کھا رہے ہونگے۔ ہڈیاں مٹی میں مل رہی ہونگی۔ ملاؤں کے فتووں سے اس کی گردن دب رہی ہوگی۔ آروں سے اس کا جسم چیرہ جا رہا ہوگا مگر وہ ہنس رہا ہوگا۔ آنکھیں شرارت سے ناچ رہی ہونگی۔ نیلے مردہ ہونٹ تلخی سے ہل رہے ہونگے مگر کوئی اسے رُلا نہیں سکتا۔

وہ شخص جس کے پھیپھڑوں میں ناسور، ٹانگیں عرصہ سے اکڑی ہوئی، باہیں انجکشنوں سے گدی ہوئی، کولھے میں امردو برابر پھوڑا، آخری دم اور چیونٹیاں جسم میں لگنا شروع ہوگئیں۔ کیا ہنس کر کہتا ہے "یہ چیونٹی صاحبہ بھی کس قدر بے صبر ہیں یعنی قبل از وقت اپنا حصہ لینے آن پہنچیں۔" یہ مرنے سے دو دن پہلے کہا۔ دل چاہیئے۔ پتھر کا کلیجہ ہو مرتے وقت جملے کسنے کے لئے۔

ان کا ایک جملہ ہو تو لکھا جائے۔ ایک لفظ ہو جو یاد آئے پوری کی پوری کتابیں ایسے ایسے چٹکلوں سے بھری پڑی ہیں۔ دماغ تھا کہ انجن! بنا آگ پانی کے ہر وقت چلتا رہتا تھا اور زبان تھی کہ قینچی، اس قدر نپے تُلے جملے نکالتی تھی کہ جم کر رہ جاتے تھے۔

نئے لکھنے والوں کے آگے ان کی گاڑی نہیں چلی۔ دنیا بدل گئی ہے خیالات بدل گئے ہیں، ہم لوگ بد زبان ہیں اور منہ پھٹ۔ ہم دل دکھتا ہے تو رو دیتے ہیں، سرمایہ داری، سوشلزم اور بیکاری نے ہم لوگوں کو جھلسا دیا ہے۔ ہم جو کچھ لکھتے ہیں دانت پیس پیس کر لکھتے ہیں۔ اپنے پوشیدہ دکھوں، کچلے ہوئے جذبات کو زہر بنا کر اگلتے ہیں۔ وہ بھی دکھی تھے، نادار، بیمار اور مفلس تھے۔ سرمایہ داری سے عاجز۔ مگر پھر بھی اتنی ہمت تھی کہ زندگی کا منہ چڑا دیتے تھے۔ دکھ میں ٹھٹھا لگا لیتے تھے۔ وہ

افسانوں ہی میں نہیں ہنستے تھے زندگی کے ہر معاملہ میں دکھ کو ہنس کر نیچا کر دیتے تھے۔

باتوں کے اس قدر شوقین کہ دنیا کا کوئی انسان ہو، اس سے دوستی "کھر یا بہادر" میں جو "شاہ لنگران" کے حالات ہیں وہ ایک میراسن سے معلوم ہوئے۔ اس سے ایسی دوستی تھی کہ بس بیٹھے ہیں اور گھنٹوں بکواس ہو رہی ہے۔ لوگ متحیر ہیں کہ یا اللہ یہ بڑھیا میراسن سے کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ مگر جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اسی میراسن نے بتایا ہے۔

اور تو اور بھنگن، بہشتن، راہ چلتوں کو روک کر باتیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ کچھ دن اسپتال میں رہے وہاں رات کو جب خاموشی ہو جاتی آپ چپکے سے سارے مریضوں کو سمیٹ کر گپّیں اڑایا کرتے۔ ہزاروں قصّے سنتے اور سناتے وہی قصّے "سوانہ کی روحیں"، "مہارانی کا خواب"، "چمکی" اور "دیریٹرے" بن گئے۔ وہ ہر چیز زندگی سے لیتے تھے اور زندگی میں کتنے جھوٹ ہیں۔ یہی بات ہے کہ ان کی کہانیوں میں بہت سی، بعید از قیاس معلوم ہوتی ہیں۔ چونکہ ان کا شاعرانہ تخیل ہر بات کو یقین کرتا تھا۔

ان کی ناولیں بعض جگہ واہیات ہیں۔ فضول سی، خصوصًا "کولتار"، تو بالکل ردّی ہے مگر اس میں بھی حقیقت کو اصلی رنگ میں گڑبڑ کر کے لکھ دیا ہے۔ "شریر بیوی" تو بالکل فضول ہے مگر اپنے زمانے میں بڑی چلتی ہوئی چیز تھی۔

"چمکی" ایک دہکتا ہوا شعلہ ہے۔ یقین نہیں آتا کہ اس قدر سوکھا مارا انسان جس نے اپنی بیوی کے علاوہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا تخیل میں کس قدر عیاش بن جاتا ہے۔ افوہ! وہ "چمکی" کی خاموش نگاہوں کے پیغام۔ وہ ہیرو کا اس کی حرکتوں سے مسحور ہو جانا اور پھر خود مصنّف کی زندگی۔ کس قدر مکمل جھوٹ

یہ عظیم بھائی نہیں ان کا ہمزاد ہوتا تھا جوان کے جسم سے دور ہو کر حسن و عشق کی عیاشیاں کراتا ہے۔

عظیم بھائی کی مقبولیت یوں بھی موجودہ ادب میں، یعنی بالکل نئے ادب میں نہ تھی کہ وہ کھلی باتیں نہ لکھتے تھے۔ وہ عورت کا حسن دیکھتے تھے مگر اس کا جسم بہت کم دیکھتے تھے۔ جسم کی بناوٹ کی داستانیں پرانی مثنویوں "گل بکاولی" "زہرہ عشق" وغیرہ میں بہت نمایاں تھیں اور پھر انہیں پرانی کہہ دیا گیا۔ لیکن اب یہ فیشن نکلا ہے کہ وہی پرانا سینہ کا اتار چڑھاؤ۔ پنڈلیوں کی گاؤدی، رانو کا گداز نیا ادب بن گیا ہے۔ وہ اسے عریانی سمجھتے تھے اور عریانی سے ڈرتے تھے۔ گو جذبات کی عریانی ان کے یہاں عام ہے اور بہت غلیظ باتیں بھی لکھنے میں نہیں جھجکتے تھے۔ وہ عورت کے جذبات تو عریاں دیکھتے تھے مگر خود اسے کپڑے پہنے دیکھتے تھے وہ زیادہ بے تکلفی سے مجھ سے بات نہیں کرتے تھے اور بہت بچہ سمجھتے تھے۔ کبھی کسی جنسی مسئلہ پر تو وہ کسی سے بحث کرتے ہی نہ تھے۔ ایک دوست سے صرف اتنا کہا کہ "نئے ادیب بڑے جوشیلے ہیں لیکن بھوکے ہیں اور اوپر سے ان پر جنسی اثر بہت ہے۔ جو کچھ لکھتے ہیں " اماں کھانا" معلوم ہوتا ہے"۔ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ " ہندوستانی ادب میں ہر زمانہ میں جنس بہت نمایاں رہتی ہیں۔ یہاں کے لوگ جنس سے بہت متاثر ہیں۔ ہماری شاعری، مصوّری قدیم پرستش سے بھی جنسی بھوک کا پتہ چلتا ہے۔ اگر ذرا دیر عشق و محبت کو بھول جائیں تو مقبول عام نہیں رہ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت جلد ادب میں ان کا رنگ غائب ہو کر وہی "الف لیلا" کا رنگ غالب آگیا"۔

انہیں حجاب امتیاز علی سے خاص لگاؤ تھا (میں محترمہ سے معافی مانگ کر کہونگی

کہ مرنے والے کا راز ہے) کہا کرتے تھے "یہ عورت بہت پیارے جھوٹ بولتی ہے۔" انھیں شکایت تھی کہ میں بہت الٹے سیدھے جھوٹ بولتی ہوں میرے جھوٹ بھوکے کی پکار ہیں! اور ان کے جھوٹ بھوکے کی مسکراہٹیں اللہ جانے ان کا کیا مطلب ہوتا تھا۔

ہم ان کے افسانوں کو عموماً "جھوٹ" کہا کرتے تھے۔ جہاں انھوں نے کوئی بات شروع کی اور والد صاحب مرحوم ہنسے پھر "قصر صحرا" لکھنے لگے؟ وہ ان کی گپوں کو "قصر صحرا" کہتے تھے۔ عظیم بھائی کہتے "سرکار دنیا میں جھوٹ بغیر کوئی رنگینی نہیں! بات کو دلچسپ بنانا چاہو تو جھوٹ اس میں ملا دو۔"

وہ یہ بھی کہتے کہ "جنت اور دوزخ کا بیان بھی تو "قصر صحرا" ہے۔"

اس پر ماموں کہتے:۔

"ارے زندہ لاش کو منع کرو یہ کفر ہے۔" اس پر وہ ماموں کے توہم پرست سسرال والوں کا تمسخر اڑاتے تھے۔

انہیں پیری مریدی ڈھونگ معلوم ہوتا تھا۔ لیکن کہتے تھے دنیا کا ہر ڈھونگ ایک مزیدار جھوٹ ہے اور جھوٹ ہی مزیدار ہے۔

کہتے تھے "میری صحت اجازت دیتی تو میں اپنے باپ کی قبر بنوا دیتا۔ بس دو سال قوالی کرا دیتا اور چادر چڑھاتا۔ مزے سے آمدنی ہوتی۔"

انھیں دھوکہ باز اور مکّار آدمی سے ملکر بڑی خوشی ہوتی تھی۔ کہتے تھے "دھوکہ اور مکّاری مذاق نہیں۔ عقل چاہئے ان چیزوں کے لئے۔"

انہیں ناچ گانے سے بڑا شوق تھا۔ مگر کس ناچ سے؟ یہ جو فقیر بچے آتے ہیں انکا۔ عموماً پیسے دیکر ڈھول میں ناچتے ہوئے فقیروں کو اس شوق سے دیکھا کرتے تھے

کہ ان کا انہماک دیکھ کر رشک آتا تھا۔ نہ جانے انہیں اس ننگے بھوکے ناچ میں کیا کچھ نظر آتا تھا۔

میں نے انھیں کبھی نماز پڑھتے نہ دیکھا۔ قرآن شریف لیٹ کر پڑھتے تھے اور بے ادبی سے اس کے ساتھ ساتھ سو جاتے تھے۔ لوگوں نے ملامت کی تو اس پر کاغذ چڑھا کر کہدیا کرتے تھے کچھ نہیں قانونی کتاب ہے۔ جھوٹ تو خوب بنھاتے تھے!۔

حدیث بہت پڑھتے تھے اور لوگوں سے بحث کرنے کے لئے عجیب عجیب حدیثیں ڈھونڈ کر حفظ کر لیتے تھے اور سنا کر لڑا کرتے تھے۔ ان کی حدیثوں سے لوگ بڑے عاجز تھے۔ قرآن کی آیات بھی یاد تھیں اور بے تکان حوالہ دیتے تھے۔ شک کرو تو سرہانے سے قرآن نکال کر دکھا دیتے تھے۔

یزید کے بڑے مدّاح تھے اور امام حسین کی شان میں بکواس کیا کرتے تھے لوگوں سے گھنٹوں بحث ہوتی تھی۔ کہتے تھے "میں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت امام حسین کھڑے ہیں ادھر سے یزید لعین آیا، آپ کے پیر پکڑ لئے، گڑگڑایا، ہاتھ جوڑے تو آپ کا خون جوش مارنے لگا اور اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ بس میں نے بھی اس دن سے یزید کی عزّت شروع کر دی۔ جنّت میں تو ان کا ملاپ بھی ہو گیا، پھر ہم کیوں لڑیں"۔

سیاست سے کم دلچسپی تھی۔ کہتے تھے "یا با ہم لیڈر بن نہیں سکتے تو پھر کیا کہیں، لوگ کہیں گے تم ہی کچھ کر کے دکھاؤ اور یہاں کمبخت کھانسی اور دمہ نہیں چھوڑتا"۔ بہت سال ہوئے کچھ مضامین "ریاست" میں سیاسیات اور اکنامکس پر لکھے تھے وہ نہ جانے کیا ہوئے۔ مذہب کا جنون سا تھا۔ مگر آخر میں بحث کم کر دی تھی اور کہتے تھے:۔

"بھئی تم لوگ تو ہٹے کٹے ہو اور میں مرنے والا ہوں اور جو کہیں دوزخ جنّت

سب نکل آئیں تو کیا کروں گا۔ لہذا چپ ہی رہو۔" پردہ کے خلاف تو کبھی سے تھے مگر آخر میں کہتے تھے "یہ پرانی بات ہوگئی اب پردہ روکے نہیں رک سکتا۔ اس معاملہ میں ہم کرچکے۔ اتنی پریشانیاں ہیں"، لوگ کہتے تھے دوزخ میں جاؤ گے۔ تو فرماتے۔ "یہاں کونسی اللہ میاں نے جنت دیدی جو وہاں دوزخ کی دھمکیاں ہیں۔ کچھ پرواہ نہیں ہم تو عادی ہیں۔ اللہ میاں اگر ہمیں دوزخ میں جلائیں گے تو ان کی لکڑی اور کوئلہ بیکار جائے گا۔ کیونکہ ہم تو ہر عذاب کے عادی ہیں"۔ کبھی کہتے" اگر دوزخ میں رہے تو ہمارے جراثیم تو مرجائیں گے۔ جنت میں تو ہم سارے مولویوں کو دق میں لپیٹ لیں گے۔"

یہی وجہ ہے کہ سب انھیں "باغی" اور "دوزخی" کہتے ہیں۔ وہ کہیں پر بھی جائیں۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کیا وہاں بھی اُن کی وہی قینچی جیسی زبان چل رہی ہے؟ کیا وہاں وہ حوروں سے عشق لڑا رہے ہیں یا دوزخ کے فرشتوں کو جلا کر مسکرا رہے ہیں۔ مولویوں سے اُلجھ رہے ہیں یا دوزخ کے بھڑکتے شعلوں میں ان کی کھانسی گونج رہی ہے۔ پھیپھڑے پھول رہے ہیں اور فرشتے ان کے انجکشن گھونپ رہے ہیں۔ فرق ہی کیا ایک دوزخ سے دوسری دوزخ میں۔ "دوزخی" کا کیا ٹھکانا۔

عصمت چغتائی

مولانا احمد سعید
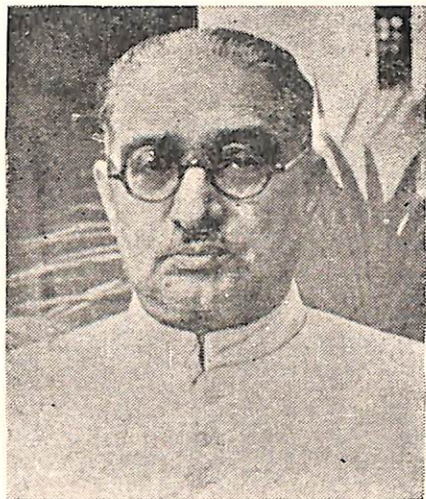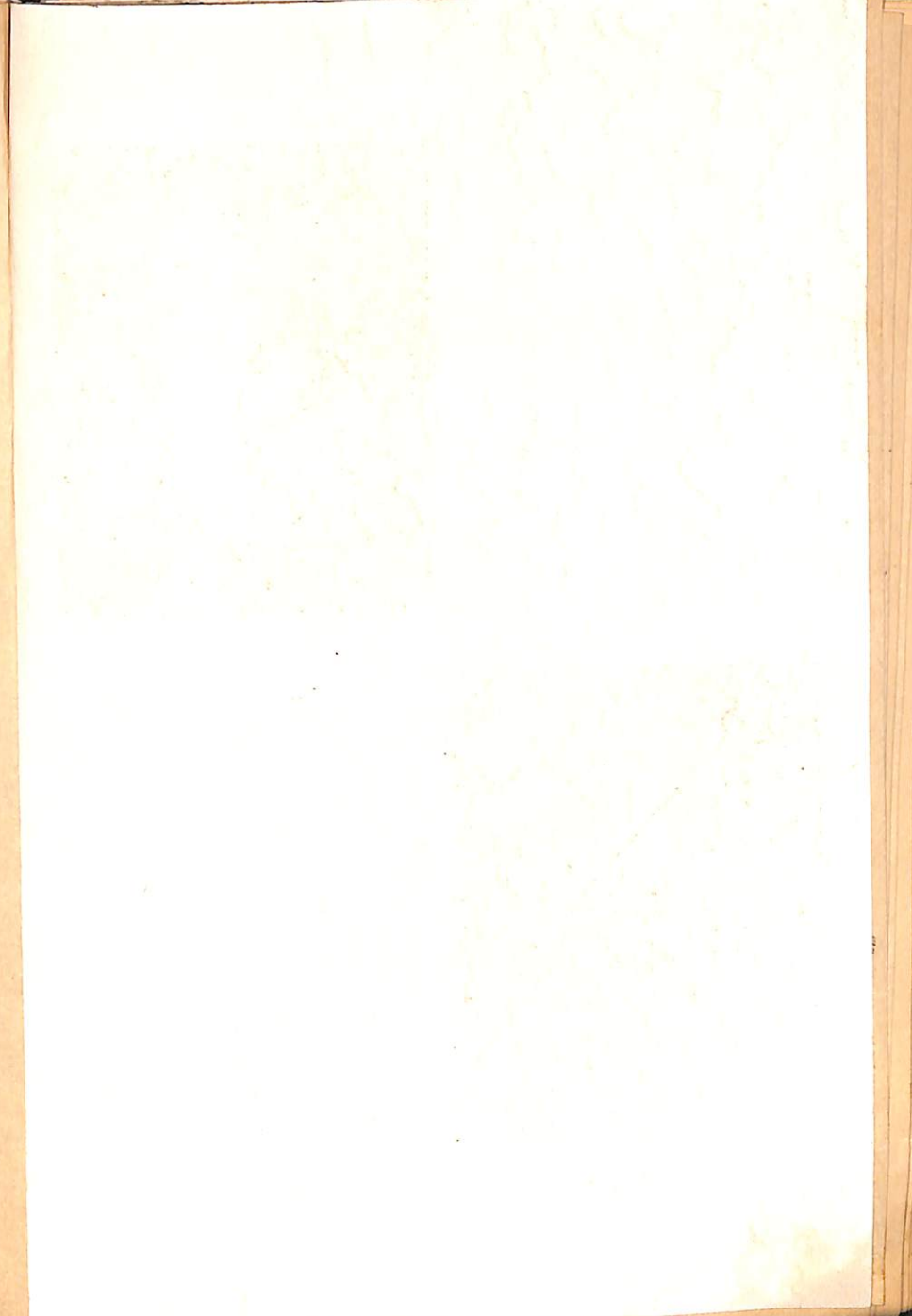
عبدالمجید سالک

عبدالمجید سالک

اردو ادب کی ایک ممتاز شخصیت ہیں یہ ۱۸۹۴ء میں بٹالہ ضلع گورداسپور
میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم اپنے والد کی زیر نگرانی حاصل کی۔ بی۔ اے کیا اور
نوکر ہو گئے۔ پانچ سال تک "تہذیب نسواں" اور "پھول" کی ادارت کے فرائض
انجام دیئے۔ سنہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۷ء تک "زمیندار" کے ایڈیٹر رہے اس کے
بعد اپنا اخبار "انقلاب" جاری کیا۔

آپ نے ٹیگور کی کچھ کتابوں کے بڑے کامیاب تراجم کئے ہیں اور ساتھ
ہی ساتھ چند عمدہ کتابیں بھی لکھیں۔

سالک صاحب بنیادی طور پر ایک صحافی ہیں لیکن ان کی صحافت ادب
سے قریب تر رہی ہے اس میں زبان و بیان اور طرز و اسلوب کی دل آویزی شامل
ہے۔ ان کا مزاح بھی ان کے مزاجِ شائستگی و شگفتگی کا آئینہ دار ہے۔

آپ کا انتقال چند سال ہوئے لاہور میں ہوا ہے۔

مولانا احمد سعید دہلوی

۱۹۲۲ء کے اواخر میں جب میں مدیر "زمیندار" کی حیثیت سے تحریکِ خلافت میں سزایاب ہو کر میانوالی جیل میں پہنچا تو چند ہی روز میں معلوم ہو گیا کہ مولانا احمد سعید ناظم جمعیۃ العلمائے ہند بھی اسی جیل کے کسی دوسرے حصّے میں موجود ہیں — وارڈروں سے کرید کرید کر جو پوچھا تو انکشاف ہوا کہ مولانا قیدیوں کے لباس میں ہیں اور مونج بٹنے کی مشقت کر رہے ہیں۔ یہ سُن کر بہت صدمہ ہوا۔ جب دوسرے دن شام کو ڈاکٹر راجمیداس سپرنٹنڈنٹ جیل دریافت حال کے لئے ہمارے وارڈ میں آئے تو میں نے اور اختر علیخاں نے ان سے کہا کہ "مولانا احمد سعید دہلوی ہمارے نہایت ہی محترم عالم دین بلکہ ہندوستان بھر کی جمعیت علماء کے سکریٹری ہیں اور مسلمانوں میں جمعیۃ علماء کانگریس اور مجلس خلافت سے کہیں زیادہ اثر نفوذ رکھتی ہے ایسی شخصیت کو عام قیدیوں کی طرح رکھنا کسی اعتبار سے قرین انصاف نہیں۔ ہم درجۂ خاص کے قیدی ہیں اور ہمیں ہر طرح کی آسائشیں میسّر ہیں لیکن ہم میں سے ہر شخص اس امر پر آمادہ ہے کہ اس کو درجۂ خاص کی رعایت سے محروم کر کے مولانا کو

اس کی جگہ اس درجہ میں شامل کر دیا جائے"۔ ڈاکٹر راجمبید اس نے کہا کہ "حکومت کی طرف سے مولانا کے متعلق کوئی ہدایات وصول نہیں ہوئیں۔ بہر حال میں کوشش کرونگا کہ مولانا کو بھی سپیشل کلاس دیدی جائے"۔

مولانا کا ورود

چند روز بعد مولانا احمد سعید ہمارے وارڈ میں تشریف لائے اور مجھے پہلی دفعہ اسی دن نیاز حاصل ہوا۔ عام قیدیوں کے کپڑے پہنے ہوئے تھے ہشاش بشرہ، چھدری سی داڑھی۔ توند کسی قدر نکلی ہوئی۔ بلند قامت۔ آنکھوں میں شفقت اور شوخی کا عجیب سا امتزاج۔ بات بات پر قہقہے لگاتے اور جیل کے لطیفے سنا کر ہمیں ہنساتے رہتے۔ معلوم ہوا کہ مولانا کو سپیشل کلاس مل گئی ہے اور وہ مستقل طور پر ہمارے وارڈ میں منتقل کر دیئے گئے ہیں بے حد خوشی ہوئی مولانا نے غسل کر کے اپنا اصلی لباس پہنا۔ سر پہ دہلی والی کڑھی ہوئی ٹوپی، شیروانی اور آڑا پاجامہ چونکہ وہ ہم سب میں بزرگ اور واجب الاحترام تھے اور ان کی شخصیت میں جاذبیت بدرجہ اتم تھی اس لیئے ہم دن بھر انہی کے گرد جمع رہتے تھے۔

درس و تدریس

کچھ مدت کے بعد جب میانوالی جیل میں قیدیوں کی ایک اور بڑی کھیپ آن پہنچی تو ہم لوگ ایک چھوٹے وارڈ میں منتقل کر دیئے گئے جو معمولاً قید محض کے اسیروں اور کم عمر قیدیوں کے لئے مخصوص تھا لیکن بلا امتیاز سالک، سیماب، اختر علی خاں، صوفی اقبال، مولوی بقا اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا داؤد غزنوی، عبد العزیز انصاری، سید عطاء اللہ شاہ وغیرہ اس وارڈ میں یکجا کر دیئے گئے۔ اور یہاں ہماری زندگی کا ایک خاص انداز شروع ہوا

حد تک پوری ہو جاتی تھی۔

طباخی میں کمال دہلی کے مولانا عبداللہ چوڑی والے بھی ہمارے ہی وارڈ میں آ گئے تھے اور ہمارے باورچی خانے کے انچارج تھے لیکن ان کے آنے سے پہلے بحث طعام کی نگرانی ہم نے مولانا احمد سعید کو سپرد کر رکھی تھی کیونکہ وہ اس معاملے میں بڑے ماہر تھے۔ اور ہمیشہ اپنے کمالات طباخی کا ثبوت دیتے رہتے تھے۔ وہ ہم سب سے پہلے اپنی یک سالہ میعاد قید ختم کر کے رہا ہو گئے۔ ہماری مجلس شیخ مجلس کے جانے کے بعد سونی ہو گئی اور میری اور عبدالعزیز انصاری کی تعلیم عربی بھی ادھوری رہ گئی۔

دلکش خطابت عام گفتگو میں مولانا کا انداز بیان نہایت دلکش معصومانہ اور خندہ آور تھا اور ان کے پاس بیٹھنے والے گھنٹوں ان کی باتیں سنتے اور اکتاہٹ کی بجائے دمبدم دلچسپی میں اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا۔ یہی حالت خطابت و تقریر کی تھی۔ مولانا نہایت ٹھیٹھ دہلوی روزمرے میں جس میں کرخنداروں کے مخصوص محاورات کی چاشنی بھی ہوتی تھی گھنٹوں تقریر فرماتے اور ہزار کا مجمع نقش بدیوار ہو کر ان کے ارشادات سنتا رہتا۔ جہاں کہیں ان کے وعظ کا اعلان ہوتا خلقت ہر طرف سے ٹوٹ پڑتی۔ میں عمر بھر بہت ہی کم جلسوں میں شامل ہوا ہوں لیکن جس زمانے میں اہل بدعت نے سلطان ابن سعود کے خلاف ملک میں ہنگامہ برپا کر رکھا تھا اور یہ الزام عائد کیا تھا کہ وہابی سپاہیوں نے روضہ اطہر پر گولیاں چلائی ہیں۔ اس فتنے کو فرو کرنے کے لئے مولانا محمد علی اور مولانا احمد سعید دہلی سے لاہور تشریف لائے تو میں صرف مولانا احمد سعید کی تقریر سننے کے لئے

اس کی جگہ اس درجہ میں شامل کر دیا جائے"۔ ڈاکٹر امجید اس نے کہا کہ حکومت کی طرف سے مولانا کے متعلق کوئی ہدایات وصول نہیں ہوئیں۔ بہر حال میں کوشش کرونگا کہ مولانا کو بھی سپیشل کلاس دیدی جائے"۔

مولانا کا ورود چند روز بعد مولانا احمد سعید ہمارے وارڈ میں تشریف لائے اور مجھے پہلی دفعہ اسی دن نیاز حاصل ہوا۔ عام قیدیوں کے کپڑے پہنے ہوئے تھے ہشاش بشاش بشرہ، چھدری سی داڑھی۔ توند کسی قدر نکلی ہوئی۔ بلند قامت۔ آنکھوں میں شفقت اور شوخی کا عجیب سا امتزاج۔ بات بات پہ قہقہے لگاتے اور جیل کے لطیفے سنا کر ہمیں ہنساتے رہتے۔ معلوم ہوا کہ مولانا کو سپیشل کلاس مل گئی ہے اور وہ مستقل طور پہ ہمارے وارڈ میں منتقل کر دیئے گئے ہیں بے حد خوشی ہوئی مولانا نے غسل کرکے اپنا اصلی لباس پہنا۔ سر پہ دہلی والی کڑھی ہوئی ٹوپی۔ شیروانی اور آڑا پاجامہ چونکہ وہ ہم سب میں بزرگ اور واجب الاحترام تھے اور ان کی شخصیت میں جاذبیت بدرجہ اتم تھی اس لیے ہم دن بھر انہی کے گرد جمع رہتے تھے۔

درس و تدریس کچھ مدت کے بعد جب میانوالی جیل میں قیدیوں کی ایک اور بڑی کھیپ آن پہنچی تو ہم لوگ ایک چھوٹے وارڈ میں منتقل کر دیئے گئے جو معمولاً قید محض کے اسیروں اور کم عمر قیدیوں کے لئے مخصوص تھا لیکن بلا امتیاز سالک، سیماب، اختر علی خاں، صوفی اقبال، مولوی بقا اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا داؤد غزنوی، عبد العزیز انصاری، سید عطاء اللہ شاہ وغیرہ اس وارڈ میں یکجا کر دیئے گئے۔ اور یہاں ہماری زندگی کا ایک خاص انداز شروع ہوا

میں نے اور عبدالعزیز انصاری نے مولانا احمد سعید سے عربی، صرف و نحو، ادب اور منطق کا سبق لینا شروع کیا۔ ایک آدھ گھنٹہ پڑھ لیتے۔ پھر ایک دو گھنٹہ آموختہ دہراتے اور اردو سے عربی میں ترجمہ کر کے مولانا کو دکھاتے۔ مولانا کا انداز تدریس اگرچہ وہی اساتذۂ قدیم کا سا تھا لیکن وہ اس میں خاص دلآویزی پیدا کر دیتے تھے۔ جس میں بیزاری ناگواری کا شائبہ بھی نہ ہوتا تھا۔ اور ہم بے تکان کتابیں پڑھتے چلے جاتے تھے۔

ایکبارہ ہیں کہ دوبارہ

جیل کی دنیا عجیب دنیا ہے وہاں قیدیوں کو بیرونی دنیا کے واقعات و حوادث کا بہت کم علم ہوتا ہے۔ خصوصاً عام اخلاقی قیدی تو اپنی جہالت کی وجہ سے بالکل ہی بے خبر ہوتے ہیں۔ قیدیوں کی دو قسمیں ہیں "اکبارہ" اور "دوبارہ" جن کو انگریزی میں CASUAL اور HABITUAL کہتے ہیں۔ "اکبارہ" وہ قیدی ہے جس کو پہلی مرتبہ جیل میں آنے کا اتفاق ہوا ہو۔ "دوبارہ" وہ جو عادی مجرم ہو اور ایک سے زیادہ بار قید ہو چکا ہو۔ مولانا نے لطیفہ سنایا کہ جب میں نیا نیا میانوالی جیل میں آیا تو ایک پرانے اور طویل المیعاد قیدی نے مجھے نماز و تلاوت میں مصروف دیکھ کر سمجھ لیا کہ مولوی ہوں ایک دن اس نے پوچھا "مولبی جی! تم نے کیا جرم کیا تھا کہ بند ہو گئے؟" میں نے کہا "بھئی ہم تو تحریک خلافت میں سزایاب ہو کر آئے ہیں"۔ قیدی کچھ نہ سمجھا۔ پھر میں نے اس کو ترک موالات، عدم تعاون، نامل ورتن اور خدا جانے کس کس لفظ اور اصطلاح کی مدد سے سمجھانے کی کوشش کی۔ نتیجہ صفر۔ میں نے پوچھا "گاندھی جی کو جانتے ہو؟" کہنے لگا ہاں! ہمارے گاؤں میں ایک گاندھی ہے جو شادی بیاہ

کے موقعہ پر عطر لگایا کرتا ہے"۔ (یعنی گندھی) آخر میں نے عاجز آ کر کہا "خلیفۃ المسلمین کو جانتے ہو؟" قیدی نے کچھ دیر سوچ کر پوچھا کہ "وہ اکبارہ ہے کہ دوبارہ؟" میں بے اختیار ہنس دیا اور تفہیم کی کوشش سے دست بردار ہو گیا۔

شیخ مجلس مولانا احمد سعید ایک عالی پایہ عالم دین اور شیوا بیان خطیب ہونے کے باوجود یبوست طبع اور تعبّس سے بالکل خالی تھے اور ہم نوجوانوں میں بیٹھ کر دن بھر لطیفہ بازی کیا کرتے تھے بلکہ جب ہم لوگ رات کو وقت گزاری اور تفریح کے لئے قوالی کرتے تو مولانا اس میں شیخ مجلس کی حیثیت سے متمکن ہوتے اور مولانا داؤد غزنوی اور عبدالعزیز انصاری بعض اوقات "حال کھیلتے کھیلتے" مولانا کی توند پر جا پڑتے۔ مولانا ہنستے بھی جاتے اور برا بھلا بھی کہتے جاتے۔ ایک دفعہ ہم نے مولانا کو ایک گیت سنانے پر بھی مجبور کر لیا۔ مولانا نے بہت مزے لے لیکر گیت گایا۔ وہ کیا تھا کسی وقت تخلیہ میں سید عطاءاللہ شاہ بخاری سے سُن لیجئے انھیں ضرور یاد ہوگا۔

داڑھی کا مسئلہ اور علمائے مصر مولانا سے اکثر دینی مسائل پر مذاکرات بھی ہوتے اور وہ اپنے علم و فضل اور بیان کے سلجھاؤ کی وجہ سے دقیق سے دقیق چیز کو بآسانی سننے والوں کے ذہن نشین کر دیتے ایک مرتبہ داڑھی کے مسئلے پر بات چیت ہوئی۔ مولانا نے اپنا مسلک واضح کیا اور حدیث رسول "قصوا الشوارب واعفوا اللحی" کو دلیل میں پیش کیا لیکن اس کے ساتھ ہی فرمانے لگے کہ دنیائے اسلام کے دوسرے ملکوں کے علماء اس معاملے میں اتنے شدید و متشدد نہیں ہیں جتنے ہمارے علماء ہیں۔ پھر فرمایا میں چند ماہ پیشتر

مصر گیا تھا۔ وہاں مجھے ایک عجیب و غریب معاملہ پیش آیا۔ نماز کے لئے ایک مسجد
میں گیا ابھی وضو ہی کر رہا تھا کہ محسوس کیا بعض لوگ بڑے غور سے مجھے گھور رہے
ہیں۔ سوچا کہ غیر ملکی ہوں اسلئے دیکھ رہے ہونگے۔ لیکن ایک دو منٹ بعد ہی ایک
پوچھ بیٹھا "اَنْتَ یہودی؟" میں نے جواب دیا۔ "لا واللہ انا مسلم الحمد للہ"۔ پھر اس
نے کہا کہ تمہاری پھیلی ہوئی اور غیر مرتب داڑھی بالکل یہودیوں کی سی ہے۔ یہ درست
نہیں۔ من تشبہ بقومٍ فھو منھم قرآن مجید کہتا ہے کہ جو شخص کسی قوم سے تشبہ
پیدا کرتا ہے وہ اسی قوم میں سے ہے۔ میں یہ سنکر بے حد پریشان ہوا کہ ہم تو ہندوستان
میں داڑھی منڈانے والوں کو یہ آیت سنایا کرتے ہیں۔ یہاں الٹا ہی آیت ہماری
داڑھیوں پر منطبق کی جا رہی ہے۔

نماز پڑھنے کے بعد سیدھا جامعہ ازہر چلا گیا کیوں کہ حضرت شیخ الازہر سے
ملاقات کا وقت مقرر ہو چکا تھا۔ جامعہ کے اندر جاکر جس کمرے میں جھانکتا ہوں
یہی نظر آتا ہے کہ ایک فرنچ کٹ یا خشخشی داڑھی والے معلم طلبہ کے سامنے کھڑے
ہیں اور حدیث بخاری پر لیکچر دے رہے ہیں۔ ایک قریب قریب داڑھی منڈا آدمی
فقہ حنفیہ کے غوامض و نکات نہایت فصیح و بلیغ عربی میں بیان کر رہا ہے۔ خیر جب میں
رہبر کی مدد سے حضرت شیخ الازہر کے فیشن ایبل ڈرائنگ روم میں پہنچا تو ان کے
چہرے پر میں نے پوری داڑھی دیکھی۔ علیک سلیک کے بعد پہلے تو مسئلہ خلافت
اور سیاسیات عالم اسلامی پر گفتگو ہوتی رہی۔ اس کے بعد میں نے پوچھا حضرت داڑھی
کے متعلق آپ لوگوں کا مسلک کیا ہے۔ میں نے تو یہاں آکر دیکھا کہ رسول اللہ کی اس
سنت پر بہت ہی کم عمل ہوتا ہے اور خود علماء بھی اس کے تارک ہیں۔

واجب نہیں مستحب

شیخ الازہر مسکرائے اور کہا۔ ہندوستان میں لوگ اس قسم کے غیر اہم مسائل پر تضیع اوقات کیا کرتے ہیں۔ حالانکہ اوضاع ظاہری کا معاملہ امور شرعیہ میں شامل نہیں ہے۔ میں نے گذارش کی کہ آپ بھی تو فقہ حنفی پر عامل ہیں۔ اصول فقہ میں ہے "الامر للوجوب" خدا اور رسول نے جن امور کے متعلق حکم دیا ہے اس کی تعمیل واجب ہے۔ شیخ نے فرمایا کہ ہر کلیہ کا استثنا ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک اوضاع ظاہری میں یہ وجوب ساقط ہو جاتا ہے ہم اس کو استحباب کا درجہ دیتے ہیں اگر کوئی مسلمان بہ نیت اتباع رسول داڑھی رکھتا ہے تو اس کو یقیناً ثواب ہوگا اگر منڈاتا یا ترشواتا ہے تو اس پر کوئی عذاب نہ ہوگا۔ میں خود حکم رسولؐ کی تعمیل میں داڑھی رکھتا ہوں اور ثواب کا متوقع ہوں۔ میرے رفقا نہیں رکھتے۔ میں انھیں نہ گمراہ سمجھتا ہوں۔ نہ مستوجب عذاب خیال کرتا ہوں۔

مولانا احمد سعید دنیائے اسلام کے سب سے بڑے دینی مدرسہ کے رئیس اعلیٰ کی یہ بحث سن کر خاموش ہو گئے اور سلام و دعا کے بعد واپس چلے آئے۔

جیل میں پان

مولانا احمد سعید پان کھانے کے عادی تھے لیکن جیل میں پان کہاں قریب قریب ہر درجۂ خاص کے قیدی کو اس کے اعزا باہر سے کچھ کھانے پینے کی چیزیں بھیجا کرتے تھے۔ ایک دو دفعہ دہلی سے مولانا کی چیزوں میں۔ ایک تھیلا گٹکے کا بھی آیا (پان بناکر اور چھالیا اور زردہ شامل کرکے سکھا لیتے ہیں اور اس کے بعد اس کو تھیلے میں بند کر رکھتے ہیں۔ یہ گٹکا کہلاتا ہے) جس کی ایک آدھ چٹکی کھانے کے بعد مجھے بھی مل جایا کرتی تھی اور پان کھانے کی طلب کسی

حد تک پوری ہو جاتی تھی۔

طباخی میں کمال دہلی کے مولانا عبداللہ چوڑی والے بھی ہمارے ہی وارڈ میں آگئے تھے اور ہمارے باورچی خانے کے انچارج تھے لیکن ان کے آنے سے پہلے بخت طعام کی نگرانی ہم نے مولانا احمد سعید کو سپرد کر رکھی تھی کیونکہ وہ اس معاملے میں بڑے ماہر تھے۔ اور ہمیشہ اپنے کمالات طباخی کا ثبوت دیتے رہتے تھے۔ وہ ہم سب سے پہلے اپنی یک سالہ میعاد قید ختم کر کے رہا ہو گئے۔ ہماری مجلس شیخ مجلس کے جانے کے بعد سونی ہو گئی اور میری اور عبدالعزیز انصاری کی تعلیم عربی بھی ادھوری رہ گئی۔

دلکش خطابت عام گفتگو میں مولانا کا انداز بیان نہایت دلکش معصومانہ اور خندہ آور تھا اور ان کے پاس بیٹھنے والے گھنٹوں ان کی باتیں سنتے اور اکتاہٹ کی بجائے دمبدم دلچسپی میں اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا۔ یہی حالت خطابت و تقریر کی تھی۔ مولانا نہایت ٹھیٹھ دہلوی روزمرے میں جس میں کرخنداروں کے مخصوص محاورات کی چاشنی بھی ہوتی تھی گھنٹوں تقریر فرماتے اور ہزار کا مجمع نقش بدیوار ہو کر ان کے ارشادات سنتا رہتا۔ جہاں کہیں ان کے وعظ کا اعلان ہوتا خلقت ہر طرف سے ٹوٹ پڑتی۔ میں عمر بھر بہت ہی کم جلسوں میں شامل ہوا ہوں لیکن جس زمانے میں اہل بدعت نے سلطان ابن سعود کے خلاف ملک میں ہنگامہ برپا کر رکھا تھا اور یہ الزام عائد کیا تھا کہ وہابی سپاہیوں نے روضہ اطہر پر گولیاں چلائی ہیں۔ اس فتنے کو فرو کرنے کے لئے مولانا محمد علی اور مولانا احمد سعید دہلی سے لاہور تشریف لائے تو میں صرف مولانا احمد سعید کی تقریر سننے کے لئے

باغ بیرون دہلی دروازے کے عظیم الشان جلسے میں شامل ہوا اور مولانا کی شیوا بیانی کی یاد اب تک اپنے دماغ میں محفوظ پاتا ہوں۔

تصانیف مولانا کے کمالات صرف تقریر تک محدود نہیں ہیں بلکہ آپ نے متعدد سلیس و مفید کتابیں بھی لکھی ہیں۔ دوزخ کا کھٹکا، جنّت کی کنجی، رسول کی باتیں، مضامین احمد سعید، تقاریر احمد سعید، شوکت آرا بیگم اور متعدد دیگر رسائل جو چھپ کر مقبولِ عام ہو چکے ہیں۔ اگرچہ مولانا کی عمر اسّی کے قریب ہو چکی ہے۔ لیکن تصنیف و تالیف کا مشغلہ برابر جاری ہے۔ آجکل "عام فہم اردو" میں تفسیر قرآن لکھ رہے ہیں جس کی چند سورتیں شائع ہو چکی ہیں اللہ تعالیٰ تکمیل کی مہلت عطا فرمائے۔

آپ نے تقسیم کے بعد انتہائی ابتلا و آزمائش کے کوائف کے باوجود دہلی ہی میں مقیم رہنا پسند فرمایا۔ اور وہیں مسلمانوں کی خدمت میں مصروف ہوئے۔ مجھے تقسیم کے بعد دو دفعہ دہلی جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ دونوں موقعوں پر میں حصولِ نیاز کے لئے حاضرِ خدمت ہوا۔ حسبِ عادت نہایت محبت اور بے تکلّفی سے پیش آئے۔ پہلی دفعہ پنڈت رام ناتھ (سابق مینجر انقلاب) ساتھ تھے۔ دوسری بار پروفیسر صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کی معیّت میں حاضر ہوا۔ کہن سالی کے باوجود مولانا کی صحت بہت اچھّی ہے۔ چہرے پر بدستور سرخی اور بشاشت کا نور نمایاں ہے۔

عبدالمجید سالک
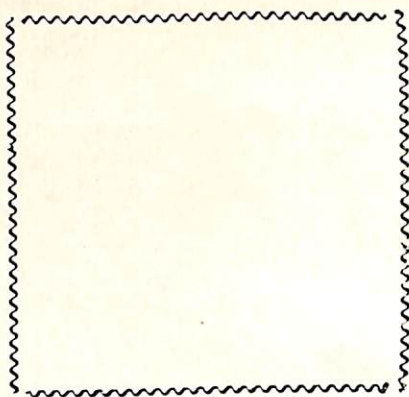
بی مرادن

ایم - ایم بیگ
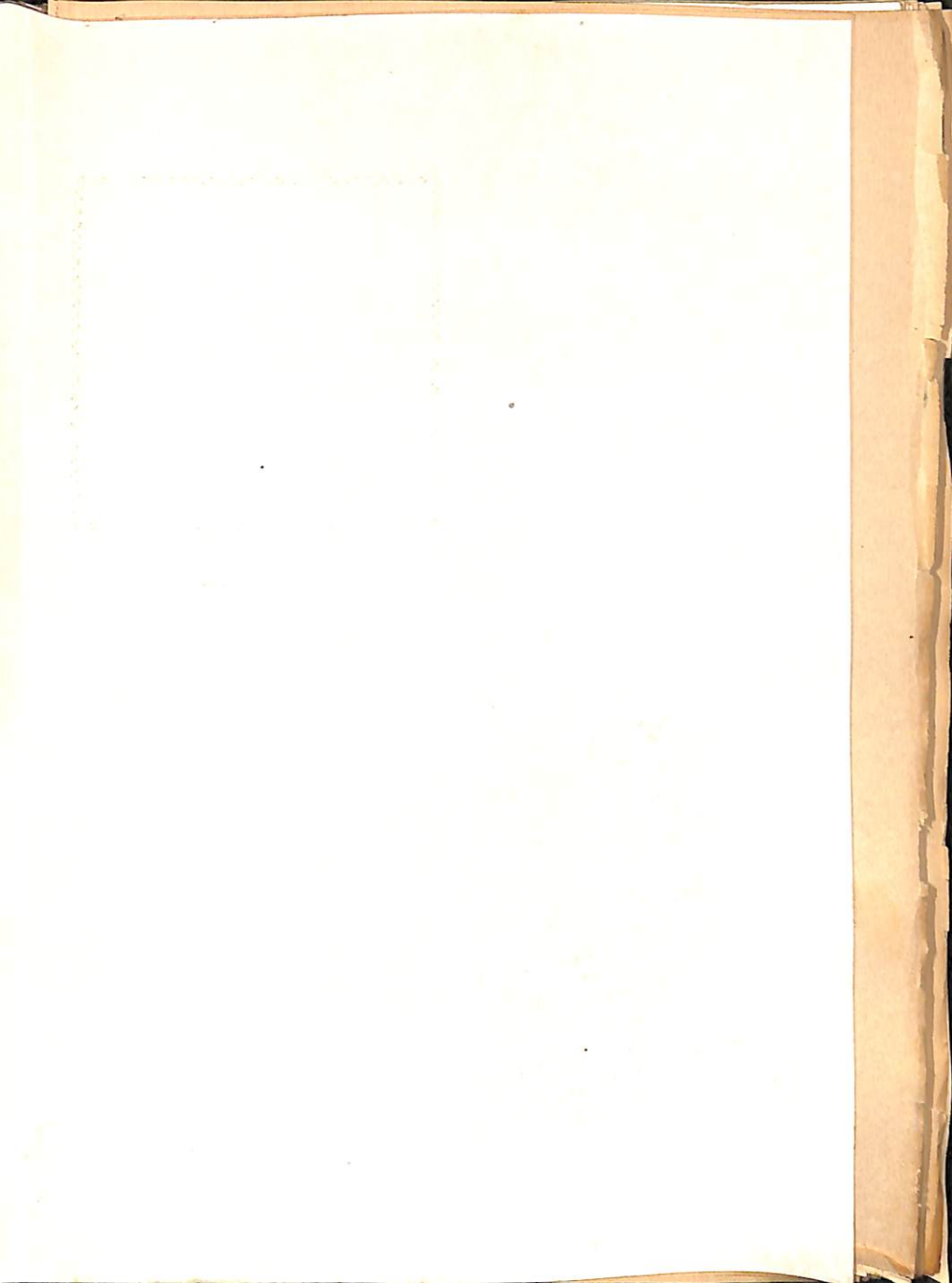
مرزا محمود بیگ

آزادی کے بعد دِلّی کی قدیم روایات اور وضعداریوں کو زندہ رکھنے والوں میں بیگ صاحب کا نام سرِفہرست آتا ہے۔ بیگ صاحب اگست ۱۹۰۸ء میں دِلّی میں پیدا ہوئے۔ آپ ان دِلّی والوں میں سے ہیں جنہوں نے تقسیم کے بعد آگ اور خون کے سیلاب میں بھی وطنِ عزیز کو چھوڑ کر جانا گوارا نہ کیا۔ ؎

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا (میرؔ)

بیگ صاحب نے دِلّی کی محفلیں دیکھی ہیں۔ بزرگوں کی باتیں سنی ہیں اس لئے انہیں دِلّی والوں اور دِلّی والیوں کے لب و لہجے میں جو کمال حاصل ہے وہ آج کے ادیبوں میں کسی کو میسّر نہیں۔ بیگ صاحب باتوں باتوں میں بڑے کام کی باتیں کہہ دینے پر قدرت رکھتے ہیں۔ ان کے لبوں کی شیرینی اور لہجے کی گھلاوٹ نہ صرف ان

کی گفتگو اور ریڈیائی تقاریر میں اثر پیدا کرتی ہے بلکہ ان کی تحریروں میں بھی یہ صفت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ بیگ صاحب خوش مزاج، خوش کلام، خوش لباس اور خوش بیان آدمی ہیں ان کی تحریروں میں نفاست، حُسن اور دلربائی پیدا کرنے میں ان کی طبیعت کے اس عنصر کو بڑا دخل ہے۔

بیگ صاحب کو تہذیب اور معاشرت کے گوناگوں پہلوؤں سے گہری دلچسپی ہے ان کے اکثر مضامین حال یا ماضی کی زندگی کے اوراق کی عکّاسی کرتے ہیں۔ عورتوں کی زندگی، ان کی نفسیات، تہذیبی قدروں اور رسوم و اطوار سے بیگ صاحب کو جو واقفیت ہے وہ آغا حیدر حسن جیسے بزرگوں کے علاوہ غالباً کسی کو کم ہوگی یہی وجہ ہے کہ ان کے وہ خاکے جو دھوبن، ڈومنی، کاچھن اور کہارن وغیرہ کی زندگی پیش کرتے ہیں بے مثال اور کمیاب خاکے ہیں۔

آپ آج کل دِلّی کالج کے پرنسپل ہیں۔

بی مُرادن

بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو سب سے دلچسپ اور مشکل کام ہوتا ہے اسکا نام رکھنا۔ دادا، دادی، نانا، نانی، چچا، ماموں، چچی، مومانی، خالہ، پھوپی، چھوٹی تائی اور بڑی تائی سب اپنا حق اور فرض سمجھتے ہیں کہ بچے کے لئے نام تجویز کریں۔ کوئی بچے کو آفت اور بلا سے محفوظ رکھنے کے لئے ایسے نام تجویز کرتا ہے جو عاجزی اور خاکساری کا نمونہ ہوتے ہیں جیسے کوڑامل یا چوہارام۔ کوئی بچے کے مستقبل کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے ایسے نام تجویز کرتے ہیں جو ان کے خیال میں دولت، طاقت یا علم کی معراج ہوتے ہیں جرنیل سنگھ یا محمد فاضل۔ کبھی خود اپنی قابلیت جتانے کے لئے تاریخ سے یا ڈکشنری سے بڑے بڑے نام نکالے جاتے ہیں۔ جیسے خضر سکندر۔ اَن پڑھ یا جاہل لوگ چونکہ اتنی قابلیت نہیں رکھتے اس لئے وہ دِنوں پر یا تہواروں پر نام رکھ دیتے ہیں۔ جیسے منگل سنگھ، بدھو رام، عیدن، شبراتی، بیساکھی سنگھ۔ اکثر غریب لوگوں میں قسمت کے فرشتے کو خوش کرنے کے لئے ایسے نام بھی رکھے جاتے ہیں۔ جیسے بختاور بیگم، نصیبن یا مرادن۔ اور مجھے یقین ہے کہ جن بی مرادن کا میں آج ذکر کروں گا۔ ان کے ماں باپ نے بھی

جن ارمانوں، جن آرزوں جن مرادوں کو دل میں رکھ کر اپنی بچی کا نام مرادن رکھا تھا وہ سب اس نے بڑے ہو کر پوری کیں۔ کیونکہ دِلّی شہر میں بی مرادن سے زیادہ مشہور کوئی ڈومنی نہیں سُننے میں آئی۔

لیکن جو لوگ پچاس سال پہلے کی دِلّی کی زندگی سے واقف نہیں ہیں وہ ڈومنی کے لفظ کا مطلب کبھی نہیں سمجھیں گے۔ ڈوم کا لفظ پیشے کا نام تھا مگر اب ایک ذات کا نام ہے جیسے جُلاہے، چمار، کھٹیک وغیرہ یہ لوگ عام طور پر گاؤں میں قصبوں میں معمولی معمولی کام کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ اور جب ڈومنی کا لفظ کوئی سنتا ہے تو اس کے دل میں یہی خیال آتا ہے کہ جیسے جلاہا، جلاہی، چمار چماری اسی طرح ڈوم ڈومنی۔

مگر آج سے پچاس سال پہلے کی دِلّی میں ڈومنی شاید ڈوم کی بیوی ضرور تھی مگر بہت کچھ اور بھی تھی۔ وہ اس زمانے کی دِلّی کے گھروں میں اور تقریبوں میں ایک خاص جگہ اور ایک خاص حیثیت رکھتی تھی۔

یہ وہ زمانے تھے جب تفریح کے سامان کم تھے۔ مردوں کے لئے دنگل تھے، مرغوں اور بٹیروں کی لڑائیاں تھیں، گتکے اور بنوٹ کے مقابلے تھے تیراکی کے میلے تھے۔ تیتر بازی اور کبوتر بازی کے فن کے مظاہرے تھے اور جب اس سے دل نہ بھرتا تھا تو مردانوں میں دیوان خانوں میں طوائفوں کے ناچ تھے۔ مجرے تھے اور عورتوں کے لئے ــــــ ان کے لئے گھر تھا اور گھر کی چار دیواری تھی۔ مگر انسان تو انسان ہے۔ خواہ مرد ہو خواہ عورت خواہ اس زمانے کی دِلّی کا خواہ آج سے پچاس سال پہلے کی دِلّی کا۔ اس کو تفریح کا سامان چاہیئے۔ اس لئے گھر کی چار دیواری میں ہی دل بہلانے

کے سامان مہیا ہو جاتے یا کر لئے جاتے تھے۔ شادی بیاہ، چھٹی چھوچھک آمین بسم اللہ، منگنی چوتھی، یہ سب بہانے تھے تفریح کے اور ان سے پورا فائدہ اٹھایا جاتا تھا۔ فرصتیں تھیں سستے سمے تھے اس لئے مہمانوں کو جمع کرنا مشکل کام نہ تھا۔ اور پانچ پانچ دس دس روز مہمانداری کوئی عجیب بات نہ تھی۔ بڑی بوڑھیاں اپنے گرد سب کو ہنستا بولتا دیکھ کر خوش ہوتی تھیں اور بیاہی، بن بیاہی اپنی اپنی ٹولیاں بنا ہنسی مذاق میں قہقہے، کلکاریاں لگا کر اپنا دل خوش کر لیتی تھیں۔

مگر گیت کون گائے؟ گانا کون سنائے؟ شریف زادیوں کے لئے تال سُر سے گانا عیب تھا۔ گاؤں میں گھر کی، کنبے کی، برادری کی پاس پڑوس کی عورتیں رل مل کر گیت گا سکتی ہیں۔ ہاتھ میں چھلا پہن مٹکا لے یا ڈھولک منگوا اچھا خاصا رنگ جما سکتی ہیں۔ مگر شہر کی عورتیں اور دِلّی شہر کی عورتیں وہ شریف زادیاں وہ بیگمیں۔ وہ پردوں اور چلمنوں کے پیچھے رہنے والیاں اس طرح بیٹھ کر گیت گائیں۔ توبہ! توبہ!

جھولے کی بات اور تھی۔ ننھی ننھی بچیوں کی بات اور تھی۔ مگر بھری محفل میں کوئی لے سے گیت گائے بھلا یہ کیسے ہو سکتا تھا!

اور گیت کے بغیر محفل کی رونق نہیں۔ گانے کے بغیر اور ناچ میں پائل کی آواز کے بغیر دل خوش نہیں ہوتا۔ طوائفوں کو گھر کے اندر بلا نہیں سکتے۔ وہ تو مردانے میں آ سکتی تھیں گو تاک جھانک کر ان کو دیکھا ضرور جاتا تھا۔ ان کو جو بیل پڑتی تھی اس کا چپکے چپکے ذکر ضرور ہوتا تھا۔ لیکن طوائفیں شریف زادیوں کی محفل میں آئیں؟ ناممکن! اول تو وہ بھی بھلا کیوں آنے لگی تھیں۔ ان کے قدر دان اور تھے۔ اور وہ ملتے تھے دیوان خانوں میں۔

اس مشکل کو حل کیا تھا اس زمانے کی ڈومنی نے۔ اور یہ ڈومنی شائستہ تھی۔

بیگمات کی زبان ان کے ادب آداب سے واقف تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ اپنی لطیفے دار زبان میں نقلیں اتار کر سب کو اتنا ہنسا سکتی تھی کہ لوٹ پوٹ ہو جائیں۔ یہ گاتی بھی تھی مگر گانے کے فن کی زیادہ ماہر نہ تھی۔ زیادہ ریاض نہیں کرتی تھی۔ مگر ٹھمری، وادرے دل خوش کرنے کے لئے گا لیتی تھی۔ ساز کی بھی زیادہ ضرورت نہ تھی۔ نہ سارنگی کی ضرورت تھی نہ طبلے کی جوڑی کی۔ بس ایک ڈھولک سے کام چل جاتا تھا۔ ناچ بھی لیتی تھی۔ مگر ماہروں کی طرح نہیں ہاں رونق ضرور پیدا کر دیتی تھی۔

اور ایسی ہی ایک ڈومنی تھیں "بی مرادن"۔ مگر اور ڈومنیوں کے مقابلے میں ان کے فن کی شہرت زیادہ تھی اس میں شاید ان کی شخصیت کو کافی دخل تھا۔ قد لمبا نہیں بہت لمبا تھا جب کھڑی ہوتی تھیں سب سے اونچی نظر آتی تھیں رنگ گورا تھا۔ ناک نقشہ جوانی میں بہت اچھا ہوگا۔ مگر جب ہم نے انھیں دیکھا تو آثار بتاتے تھے کہ یہ جوانی میں کیا ہونگی۔ آواز خدا نے ان کو ایسی دی تھی کہ آجکل لاؤڈ سپیکر سے بھی کیا آواز نکلے گی جب بیگموں سے باتیں کرتی تھیں تو کوشش کرتی تھیں کہ بہت نیچی آواز سے بولیں مگر پھر بھی ساری محفل میں ان کی ہی آواز سنائی دیتی تھی۔ اور جب اپنی نوچیوں کو ڈانٹتی تھیں تو بس توبہ ہی بھلی، دوسرے محلے میں خبر ہو جاتی تھی کہ بی مرادن آئی ہوئی ہیں۔

جب یہ تقریب پر آتی تھیں تو پورا طائفہ ساتھ ہوتا تھا۔ ڈھولک والی الگ۔ آواز ملانے والی الگ۔ ناچنے والی الگ اور دو چار اور چھوٹی لڑکیاں جن کو سکھانے کی خاطر ساتھ لایا جاتا تھا۔ پورا کا پورا طائفہ اور مہمانوں کے آنے سے گھنٹے دو گھنٹے پہلے آجاتا تھا۔ ساتھ ایک بڑی گٹھری ہوتی تھی۔ جس میں بیچک لگی پشوازیں اور دوسرے بھاری بھاری کپڑے ہوتے تھے۔ آگے آگے بی مرادن پیچھے پیچھے ان کی نوچیاں۔ آتے

ہی انھوں نے بیگم کی بلائیں لیں سب گھروالوں کو دعائیں دیں اور دالان میں ایک طرف جم گئیں۔ ان کے لئے پٹاری کا انتظام الگ ہوتا تھا۔ لال قند کی صافی میں رکھے ہوئے بڑے بڑے پان اور کتھے چونے چھالیہ سے معمور پٹاری ان کے سامنے رکھ دی جاتی تھی اب سروتے سے کھٹ کھٹ چھالیہ کتری جا رہی ہے۔ پان پر پان کلوں میں رکھے جا رہے ہیں۔ منہ اونچا کر کے چٹکی سے زردہ بھی کھایا جا رہا ہے۔ اور بیگم سے باتیں بھی ہو رہی ہیں۔ ان باتوں میں تقریبوں کا بھی ذکر ہے اپنے دوسرے ٹھکانوں کا بھی ذکر ہے۔ بیگم کے لینے دینے کی بھی تعریفیں تھیں۔ اپنے فن کی تعریف بھی ہے اور زمانے کی شکایت بھی۔ غرض کہ بات چیت کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ڈولی پہ ڈولی پلٹیں پہ پلٹیں۔ پالکی پہ پالکی آ رہی ہے بیگم صاحبہ کبھی پیش قدمی کے لئے صحن میں جا رہی ہیں کبھی دالان میں ہی مہمانوں سے گلے مل رہی ہیں۔ بی مرادن اب بیگم کو مصروف پا کر دوسرے مہمانوں سے مخاطب ہیں مگر اس طرح کہ کسی کے کام میں ہرج نہ ہو۔ دستر خوان بچھا۔ مہمانوں نے کھانا کھایا۔ ڈومنیوں کو بھی ایک طرف کھانا دیا گیا۔ انھوں نے تین وقت کا کھانا ایک ہی وقت میں کھایا اور ساتھ باندھ بھی لیا۔ کیونکہ یہ بھی ایک رواج تھا۔ وجہ تو میں نے کبھی پوچھی نہیں مگر ہمیشہ ہوتے ضرور دیکھا۔ شاید جن مردوں اور بچوں کو گھر چھوڑ آئے تھے۔ اُن کا حصّہ ہوتا ہوگا۔

کھانے پینے سے لوگ فارغ ہوئے اور بی مرادن اور ان کی نوچیوں نے کپڑے بدل گانا شروع کیا۔ کوئی سہرے کی فرمائش کر رہا ہے کوئی منڈھے کی۔ کبھی سمدھن کی شان میں قصیدہ کہا جا رہا ہے کبھی نقلیں شروع کر دی گئیں۔ اُن کے گانوں میں ماہر گویوں کا رنگ تھا نہ ان کی نقلوں میں مشہور نقالوں کی سی بات

تھی۔ مگر ان عورتوں۔ لڑکیوں کے لئے جنہوں نے ڈومنیوں کے علاوہ اور کسی کو دیکھا ہی نہ تھا ان سے بہتر فنکار کوئی نہ تھا۔ اور سب ہنس ہنس کر ان کو داد دیتے جاتے تھے۔

رات زیادہ ہوئی مہمانوں کو نیند آنے لگی۔ سب دو دو چار چار اِدھر اُدھر جا سوئے۔ اور ڈومنیاں بھی ایک کونے میں فرش پر ہی سو گئیں۔ دوسرے دن صبح اچھا بڑا ناشتہ کیا۔ اگر دن میں ان کی ضرورت ہوئی تو ٹھہر گئیں۔ نہیں تو دعائیں دیتی ہوئی گھر کو سدھاریں۔

مگر بی مرادن صرف تقریب پر ڈومنیوں کی سردار تھیں۔ اپنے ٹھکانوں پر بغیر تقریب کے بھی جاتی تھیں ساتھ صرف ایک آدھ نوچی ہوتی تھی۔ پان کھانے میں ان کے مقابلے کا دوسرا نہ تھا۔ اگر بیگم کے ہاتھ کے پان کھاتیں تو بیگم کے ہاتھ تھک جاتے۔ اس لئے یہ پٹاری اپنی طرف سرکا کر خود بھی کھاتی تھیں بیگم کو بھی کھلاتی تھیں۔ باتوں میں باتیں رشتے کی بھی ہوتی تھیں۔ ان کو ہر لڑکی چاند کا ٹکڑا دکھائی دیتی تھی۔ چاند کے منھ پر داغ ہے مگر جن لڑکیوں کی یہ تعریف کرتی تھیں ان میں اتنا نقص بھی نہ تھا۔ اگر ان کے شروع کرنے پر رشتہ پکا ہو گیا تو ان کو ان کی نوچیوں کو جوڑے ملتے تھے۔ کان کی بالیاں یا ہاتھ کی چوڑیاں۔ کڑے یا پہونچیاں بھی مل جاتی تھیں اور یہ ان کا حق ہوتا تھا۔ سب کی خوشی میں یہ بھی شریک تھیں۔

بی مرادن کی عمر جتنی زیادہ ہوتی گئی ان کے چہرے کا نور بھی زیادہ ہوتا گیا۔ عام طور پر سفید براق کپڑے پہنتی تھیں اور بہت اچھی لگتی تھیں۔ بچوں سے بزرگانہ سلوک کرتی تھیں۔ نہ زیادہ ہنسی نہ مذاق نہ زیادہ روکھا پن میرے دیکھتے دیکھتے دِلّی بدلی۔ دِلّی والوں کے مزاج بدلے۔ ان کے طور طریق بدلے ان کی ضرورتیں بدلیں۔

سینما نے اور بولتی گاتی تصویروں نے بی مرادن اور ان کے فن کی قدر اور ضرورت کم کردی۔ لڑکیاں اب اتنی پابندی سے گھروں میں بند نہیں رکھی جاسکتی تھیں۔ اور چونکہ وہ دنیا میں اوروں کو بھی دیکھتی تھیں ان کی نگاہوں میں بی مرادن کی اب اتنی قدر نہیں رہی۔

بی مرادن بھی یہ سب کچھ دیکھتی تھیں۔ مگر وضعدار تھیں دلّی کی تہذیب ان کے رگ و ریشہ میں پیوست تھی وہ آتی رہیں۔ اگر کبھی بچوں نے ضد کر کے گانے کو یا نقل کرنے کو کہا تو انھوں نے دل بہلانے کے لئے گا یا بھی اور نقل بھی کی۔ لیکن دل سے نہیں۔ ان کو معلوم تھا کہ قدر دان زمانے کے ساتھ گئے ناقدروں کے سامنے فن کی توہین اچھی نہیں بھلا بی مرادن وضع کی پابند بچوں کو یہ کیسے بتاتیں۔ اس لئے یہ کہتے ہیں تو گا دو ان کو نقل سنا دو۔ بڑی بیگم اس بات کو سمجھتی تھیں۔ وہ بی مرادن کی اب بھی قدر کرتی تھیں ان کے لئے پٹاری اب بھی موجود تھی۔ شادی بیاہ پر نہ اتنی مہمان داری تھی نہ بی مرادن کی اتنی مانگ تھی۔ مگر ان کا نیگ وہی تھا۔ ان کے جوڑے وہی تھے۔ زمانہ بیگم صاحبہ اور بی مرادن دونوں کو پیچھے چھوڑ بہت آگے نکل گیا تھا۔ مگر قدر دان کا تعلق زمانے سے نہیں دلوں سے ہے اور جن دلوں نے ایک دوسرے کا پہلے ساتھ دیا تھا وہ اب بھی ایک دوسرے کا ساتھ دے رہے تھے۔

بی مرادن کے ماں باپ کی مرادیں۔ خود ان کے دل کی مرادیں کتنی پوری ہوئیں زمانہ شاید یہ نہ بتا سکے مگر مجھے یقین ہے کہ بی مرادن ایک بامراد عورت تھی۔

مرزا محمود بیگ
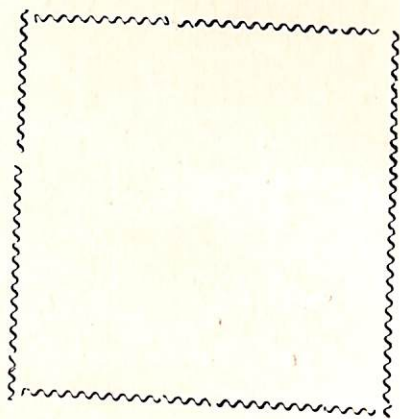
حکیم صاحب
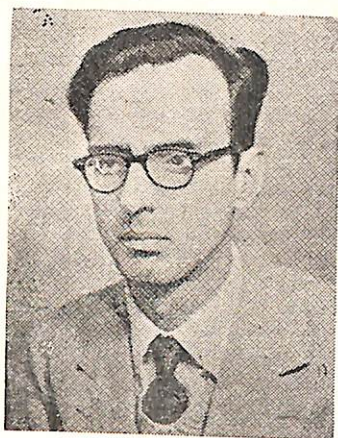
ڈاکٹر محمد حسن

ڈاکٹر محمد حسن

ہماری زبان کے ایک نامور ادیب، نقّاد اور محقّق ہیں۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں مراد آباد میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی اور وہیں سے ڈاکٹریٹ کیا۔

آپ کچھ زمانے تک "پائنیر" اخبار کی ادارت میں شامل رہے اس کے بعد شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی میں لیکچرار ہو گئے۔ آپ آج کل شعبہ اُردو دہلی یونیورسٹی میں ریڈر ہیں۔

موصوف کو شروع ہی سے افسانہ اور ڈرامہ سے دلچسپی رہی ہے۔ آپ کا ڈرامہ "پیسہ اور پرچھائیں" اردو کے مقبول ڈراموں میں سے ہے۔ آپ اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی ادب پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں۔

"اردو میں رومانوی تحریک" "جلال لکھنوی اور ان کی شاعری" "ہندی ادب کی تاریخ" "سودا ایک مطالعہ" "دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر" آپ کی تصنیفات ہیں۔

حکیم صاحب

ناکام عاشق کے بعد دنیا میں سب سے بڑی درگت ناکام استاد ہی کی بنتی ہے. ناکام عاشق کی قسمت پر دو چار آنسو بہانے والے مل بھی جاتے ہیں مگر ناکام استاد کی ناکامی پر ہنستے سب ہیں روتا کوئی نہیں۔ انتہا یہ ہے کہ جن طالب علموں کا مستقبل اس کے ہاتھوں بگڑتا ہے وہ بھی آنسو نہیں بہاتے اس کا مذاق اڑاتے ہیں پتہ نہیں اپنا یا اس کا۔

حکیم صاحب ہمارے اسکول کے بڑے پرانے ٹیچر تھے۔ لمبا قد، کسی قدر فربہ بدن۔ اس پر ڈھیلی ڈھالی شیروانی، پرکا پاجامہ، مرمروں کے تھیلی ایسی جیبیں، ہاتھ میں چھڑی، گال میں پان، چال ایسی جس پر کڑی کمان کے تیر کا گمان نہیں ہو سکتا وہ چلتے کم تھے جھومتے زیادہ تھے، اور اسی طرح جھومتے جھامتے کہیں پہنچ جاتے تھے۔ آواز بڑی دھیمی اور مشفقانہ تھی۔ یورپین ہسٹری پڑھاتے تھے اور جو کچھ پڑھاتے تھے اس کے بارے میں بہت کچھ جانتے بھی تھے۔ مگر نہ جانے کس منحوس گھڑی میں ان کا پروانۂ تقرری لکھا گیا تھا کہ شاید ہی کسی کلاس نے خاموشی سے ان کی بات سُنی ہو۔

ان کا کلاس اسکول کی پنچایت کا درجہ رکھتا تھا۔ ہر سال اسکول کے سینئر طلباء یہاں شر انگیزی اور ہنگامہ آرائی کی مشق کرتے تھے اور تازہ واردان کے انوکھے پینترے سیکھتے تھے۔ غبارے پھلائے اور پھاڑے جاتے تھے، کاغذ کے ہوائی جہاز ایک سیٹ سے دوسری سیٹ تک ہیلی کوپٹروں کی طرح سفر کرتے تھے۔ ٹوپیاں اچھالی جاتی تھیں، جوتے فرش پر گھسے جاتے تھے۔ بلی کتوں کی آوازیں نکالی جاتی تھیں فلمی گانے گائے اور فلمی ڈائیلاگ بولے جاتے تھے۔ غرض ایسا لگتا تھا جیسے دیہات میں پینٹھ لگی ہے یا یوم حساب سے قبل بدروحوں کو میدانِ حشر میں بے لگام چھوڑ دیا گیا ہے۔

شورِ نشور کے اس پس منظر میں حکیم صاحب نہایت متین اور مدہم آواز میں اپنا لیکچر دیتے رہتے تھے ان کی آواز بڑی متوازن رہتی۔ زیر و بم سے بے نیاز، نہ مدہم نہ پنچم۔ ایسا لگتا جیسے شور کسی دوسری دنیا میں ہو رہا ہے ہر مرتبہ وہ اسی صبر سکون سے رجسٹر بند کرتے اسی قدر متانت سے لیکچر شروع کرتے کبھی کبھی بلیک بورڈ پر کچھ لکھتے بھی تھے۔ جس کے بارے میں طالب علموں کو صرف اس قدر بصیرت حاصل ہوتی تھی کہ انگریزی میں کچھ لکھا ہے۔ اس پر آپس میں جملے بازی ہوتی، نوک جھوک ہوتی مگر حکیم صاحب کو کانوں کان گو یا خبر بھی نہ ہوتی تھی یا یوں کہیے کہ اگر ان کے کان پر کبھی کوئی جوں تھی وہ بھی نہ رینگتی تھی۔ ان کے ماتھے پر کبھی شکن نہ آتی۔ ان کے ہونٹ کبھی لطیف مسکراہٹ سے محروم نہ ہوتے تاآں کہ گھنٹہ بج جاتا۔ وہ شیروانی ایک جھٹکے کے ساتھ ٹھیک کرتے گویا استری کر رہے ہوں۔ چاک کے گرد و غبار سے اٹے ہوئے ہاتھ رومال سے صاف کرتے پان ڈبیہ اور رجسٹر میز پر سے

اٹھاتے اور کلاس سے مسکراتے ہوئے باہر چلے جاتے جیسے دولہا اپنی سسرال سے
رخصت ہو رہا ہو۔
کلاس کے باہر لڑکے حکیم صاحب کی بڑی عزّت کرتے تھے یا یوں کہئے دوسرے
استادوں سے ڈرتے تھے اور حکیم صاحب کو اپنا دوست سمجھتے تھے، اگر رحمٰن کیلے والا
اپنا خوانچہ لئے اسکول کے کمپاونڈ سے گذرا اور حکیم صاحب اغل بغل کہیں دکھائی
دیئے تو فوراً دس پانچ لڑکے کیلے کھانے کی فرمائش لیکر ان کی خدمت میں پہنچتے۔ اِدھر
اُدھر کی خوش گپی کے بعد حرفِ مطلب زبان پر لاتے اور یہ کبھی نہیں ہوا کہ کبھی خالی ہاتھ
لوٹے ہوں۔ حکیم صاحب اسی طرح مسکراتے جیسے کلاس سے رخصت ہو رہے ہوں اور
رحمٰن کیلے والے کا خوانچہ آدھا ہو جاتا تھا۔ یقین نہیں آتا مگر قیاس کہتا ہے کہ پہلے پہل
حکیم صاحب نے بھی لڑکوں کو قابو میں رکھنے کے لئے ضرور کچھ نہ کچھ ہتھکنڈے کھیلے
ہونگے۔ ہمارے اسکول میں ایسے کئی باکمال بزرگ تھے جو ہر طرح کی پینترہ بازی
میں طاق تھے۔ مثلاً ہمارے عربی کے استاد تھے جو سال بھر کلاس میں اپنے نہایت
پھیکے اور سیٹھے شعر سنایا کرتے تھے۔ اور انسپکٹر مدارس کے آنے پر فر فر "الحمد اللّٰہ"
سنوا دیا کرتے تھے۔ یا ہمارے سنسکرت کے ماسٹر صاحب تھے جنکا زیادہ وقت
اونگھنے میں گذرتا تھا۔ سر پہ عموماً بڑا سا صافہ ہوتا تھا جسے وہ آکر بڑے سلیقے سے
میز پر سجا کر رکھ دیتے تھے۔ سر کھجاتے تھے۔ حاضری لیکر ایک لڑکے سے کہتے "ابے
اگلا ادھیائے پڑھ"، لڑکا کھڑا ہو کر اگلا ادھیائے پڑھنے لگتا اور وہ آرام سے اپنی
کرسی میں اونگھنے لگتے انسپکٹر مدارس کے آنے پر ان کے لڑکے بھی فر فر "ہنومان
چالیسا"، سناتے تھے اور وہ حیرت سے منہ کھول کر رہ جاتا تھا کہ ع.بی اور سنسکرت

کے لڑکے کیسے عالم فاضل ہیں کہ فر فر ان زبانوں میں گفتگو کرتے ہیں۔

صافہ کا ذکرِ خیر آگیا ہے تو ایک لطیفہ سنتے چلیئے۔ پنڈت جی نے ایک بار ہوم ورک (HOME WORK) دیا۔ ایک لڑکے کو طلب کیا۔ کہ اس کی کاپی جانچی جائے گی۔ کاپی جانچتے جانچتے فونٹین پین کی روشنائی ختم ہوگئی۔ لڑکے سے کہا جا بھر لا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ واپس آتا خود حسبِ معمول اونگھ گئے۔ اس اثنا میں اس لڑکے نے فونٹین پین کو روشنائی تب تک لانے کے لئے کئی بار جو جھٹکے دیئے تو روشنائی کی بہت سی چھینٹیں پنڈت جی کے صافے پر پڑ گئیں۔ پنڈت جی کی آنکھ کھلی تو پہلی نظر صافے پر پڑی چھینٹوں کو مکھیاں سمجھ کر انھوں نے کئی بار ہش ہش کر کے ہاتھ ہلا کر اڑا دینے کی کوشش کی مگر جب کوئی مکھی نہ اڑی تو بہ غور صافے کا معائنہ کر کے اس نتیجے پر پہنچے کہ ضرور کسی لڑکے کی شرارت ہے پھر تو وہ پٹائی ہوئی کہ پورا کلاس پانی مانگ گیا۔

حکیم صاحب نے بھی بعض ہتھکنڈے ممکن ہے کئے ہوں لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ اس میں خلوص کتنا اور رشوت کتنی تھی۔ وہ لڑکوں کو ڈبیٹ (DEBATE) کیلئے تقریریں بڑی فیاضی سے لکھ کر دے دیا کرتے تھے پھر اگر کوئی لڑکا اس تقریر کو رٹ کر زور شور سے یونین میں تالیوں کی گڑگڑاہٹ کے درمیان بول ڈالے تو اس موقعہ پر حکیم صاحب ایسے خوش ہوتے اور ایسے شرماتے جیسے ابھی بَر دکھوے سے آرہے ہوں۔ وہ لڑکا گردن اکڑائے جیتا ہوا کپ یا میڈل لے کر ڈائس سے نیچے اترتا تو سب سے پہلے حکیم صاحب اسے مبارکباد دیتے۔ اس کی پیٹھ تھپتھپاتے اس سے ہاتھ ملاتے اور اس کی ایسی تعریف کرتے جیسے سچ مچ تقریر اس کی

لکھی ہوئی ہو۔

کھیل کود کے سلسلے میں بھی ان کا یہی طرزِ عمل تھا۔ کرکٹ اچھا کھیلتے تھے مگر جب کبھی لڑکوں اور اسٹاف ممبروں کا مقابلہ ہوتا، استادوں میں سب سے عظیم الشان اسکور حکیم صاحب ہی کا ہوتا تھا، ہٹ پر ہٹ لگاتے چوّئے مارتے اور چھکّے چھڑاتے تھے۔ کھیل کے میدان میں عام طور پر استادوں کی آبرو انھیں کے ہاتھ ہوتی تھی۔ مگر اصل بات یہ تھی کہ اچھے کھلاڑی کو ان کے نزدیک سات خون معاف تھے۔ اچھے کھلاڑی کی فیس جمع کرنا، اسے گھر پر پڑھانا، اس کے لئے کتابیں فراہم کرنا یہ سب کام ان کے نزدیک عبادت میں شامل تھے۔ ایسا بھی بارہا ہوا ہے کہ کسی کے کھیل سے خوش ہوئے تو اسی دن اسے لیجاکر اپنے ساتھ کھانا کھلایا ہے۔ ایسے موقعوں پر یہ اکثر ہوتا تھا کہ ایک کھلاڑی کے ساتھ اس کے یار دوست بھائی برادر بن بلائے براتی بن کر شریک ہوجاتے تھے۔

حکیم صاحب نے مجھے دو سال پڑھایا۔ آٹھویں یا نویں جماعت میں تھا کہ پہلی بار ان سے سابقہ پڑا۔ ان کی بہت سی باتیں سمجھ میں نہ آئیں۔ مثلاً کلاس کے غل غباڑے کے باوجود وہ ــــ لڑکوں سے خاموش رہنے کی سختی سے اپیل کبھی نہ کرتے تھے مثلاً یہ کہ وہ اس قدر رگن اور انہماک سے ایسے ہنگامے میں کیسے پڑھا لیتے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ ناقابلِ فہم اور حیران کن بات یہ تھی کہ وہ جب بھی کلاس میں داخل ہوتے ایک چھوٹا سا مگر نہایت خطرناک ڈنڈا ان کے پاس ضرور ہوتا تھا۔ اس کا محل استعمال کیا تھا یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہ آئی۔ ممکن ہے اس سے رجسٹر اور میز کی پیمائش میں مدد ملتی ہو مگر اس کے علاوہ شاید ہی اس کا کبھی کوئی مصرف ہوا ہو۔

پھر ایک دِن سنا کہ نئے ہیڈ ماسٹر صاحب چارج لے رہے ہیں بالکل فوجی
ڈسپلن کے آدمی ہیں بالکل سیدھے چلتے ہیں اور آج تک کبھی مسکراتے نہیں پکڑے
گئے۔ یہ بھی ہوا کہ حکیم صاحب کا کلاس ہو رہا ہے اور ادھر ہیڈ ماسٹر صاحب کن سوئیاں
لیتے ہوئے گذرتے دیکھے گئے۔ پھر اچانک یہ پتہ چلا کہ حکیم صاحب نے اسکول کی نوکری
سے استعفیٰ دیدیا ہے۔ یہ خبر ایک دھماکے کی طرح ہم سب کے سر پر پھٹ پڑی یعنی
اب حکیم صاحب کبھی اسکول نہیں آئیں گے۔ یعنی اب وہ ہمیں کبھی نہیں پڑھائیں گے۔
اس دن لڑکوں کی بے چینی دیکھنے کے قابل تھی۔ پورا اسکول شام کو حکیم صاحب کے گھر پر جمع تھا۔
سب حکیم صاحب کی زبان سے استعفیٰ کی وجہ سننا چاہتے تھے۔ حکیم صاحب اسی
طرح مسکراتے ہوئے زینے سے اُترے پھر رک کر بولے۔
"ہیڈ ماسٹر صاحب ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں میں تم پر سختی کیوں نہیں
کرتا۔ میں تمہیں سزا کیوں نہیں دیتا۔ میں کلاس میں تمہیں خاموش ہو جانے کو کیوں نہیں
کہتا۔ میں نے ان سے کہدیا لڑکوں کی تو عمر ہی ہے شرارت کی۔ مجھ سے یہ نہیں ہوگا
کہ انھیں ڈانٹوں۔ میرا ایک ہی لڑکا تھا وہ مرگیا اب یہی تو میرے بچے ہیں۔ انھیں کیسے
سزا دوں۔ مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔ آپ اپنا دوسرا انتظام کرلیجئے۔"
یہ کہتے کہتے شاید زندگی میں پہلی بار انکی آواز غصّے سے کانپی۔ شاید اس لئے کہ
انکا دل دکھ اور درد سے بھر گیا تھا للکار کر بولے "تم سب لوگ یہاں کیا کرنے آئے
ہو۔ جاؤ جا کر پڑھو" میرا سر حکیم صاحب کے سامنے عقیدت سے جھک گیا۔

ڈاکٹر محمد حسن

استاد رسا دہلوی

ڈاکٹر خلیق انجم

ڈاکٹر خلیق انجم

ڈاکٹر خلیق انجم اُردو کے جوان العمر ادیبوں اور محققوں میں سے ہیں اور لسانیات و ادبِ قدیم کے مطالعہ کا ایک خاص ذوق رکھتے ہیں۔

آپ دہلی کے ایک شریف علمی گھرانے میں پیدا ہوئے، ابتدائی اور ثانوی تعلیم دہلی میں حاصل کی اس کے بعد علی گڑھ سے بی۔ اے کیا اور پھر دہلی یونیورسٹی سے ایم۔ اے اور ڈاکٹریٹ کی سندات حاصل کیں۔ ڈاکٹریٹ کے لئے آپ کے تحقیقی مقالے کا موضوع "مرزا مظہر جان جاناں اور ان کی شخصیت وشاعری" تھا۔

"معراج العاشقین" اور "غالب کی نادر تحریریں" آپ کی مرتب کردہ کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے مرزا جان جاناں کے فارسی خطوط اور مشہور روسی ناول "تارس بلیا" کا اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔

حال ہی میں آپ کی نئی تحقیقی کتاب "سودا"، انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ سے اشاعت پذیر ہوئی ہے۔ آپ کا اسلوبِ تحریر شگفتہ، شائستہ اور سادہ ہے۔ آجکل آپ کروڑی مل کالج (دہلی یونیورسٹی) میں صدرِ شعبہ اُردو ہیں۔

استاد رسا دہلوی

جب Rider Haggard کے کردار She سے جوانی اپنا دامن چھڑانے لگتی تو وہ ایک مخصوص آگ میں کود تی، جس کے شعلوں میں جل کر اسے اپنا کھویا ہوا شباب مل جاتا اور جب وہ آگ سے نکلکر آتی تو اس کا حسن پہلے سے کہیں زیادہ تابناک اور درخشاں ہوتا یہی حال دِلّی کا ہے، جب کبھی دِلّی کسی خونی انقلاب کی آگ میں تپی ہے اس کے حسن و شباب میں پہلے سے کہیں زیادہ دلکشی و رعنائی آگئی ہے۔

میرے بزرگ ۱۹۴۷ء سے قبل کا ماتم کرتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ وہ اپنی مخصوص افتادِ مزاج اور قدیم تہذیب کے پروردہ ذہن کو نئے حالات، نئی تہذیب اور نئے تمدن کے سانچوں میں نہیں ڈھال سکتے جو ظاہر ہے بالکل فطری بات ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے میں اتنا کم عمر تھا کہ اس تہذیب اور ان اقدار سے مجھے قطعی جذباتی لگاؤ نہ ہوسکا جس کی یاد آج بھی میرے بزرگوں کی آنکھوں میں آنسو لے آتی ہے۔ میں نے ہوش سنبھال کر اس تہذیب کے باقی ماندہ آثار ضرور دیکھے ہیں جس سے اس کی عظمت و شوکت کا پتہ چلتا ہے۔ باقی ماندہ آثار سے مراد وہ بزرگ ہستیاں ہیں جو اس قدیم

تہذیب کی آخری یادگار ہیں، پنڈت ترِبھون ناتھ زار زتشی دہلوی، منشی عبد القدیر، استاد رفیق رسا اور لالہ ستیش چند سکسینہ طالب دہلوی وہ آخری چراغ ہیں جو نئی تہذیب کے تند و تیز جھونکوں میں روشن ہیں۔ ان بزرگوں کے بعد شاید اس حقیقت پر کوئی فخر نہ کر سکے کہ وہ جامع مسجد کا روڑا ہے اور چونکہ اس نے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر زبان سیکھی ہے اس لئے اس کا فرمایا ہوا مستند ہے۔

میں یہاں صرف استاد رسا دہلوی کا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ اگر آپ نے اپنی ساری زندگی دلّی میں گذاری ہے، اور ان تمام گلی کوچوں کے چپّے چپّے سے واقف ہیں جو کبھی "اوراقِ مصور" تھے لیکن اس "منتخبِ روزگار" کے نیاز حاصل نہیں کئے تو آپ نے صرف آدھی دلّی دیکھی ہے، کیونکہ باقی آدھی دلّی تو استاد کی ذات ہے۔ گویا آپ (معاف کیجئے گا) بارہ برس دلّی میں رہے اور بھاڑ ہی جھونکا کئے۔

حلیے، لباس اور بول چال نے استاد کی ذات میں انفرادیت پیدا کر رکھی ہے، سو پچاس آدمیوں میں وہ الگ پہچانے جاتے ہیں۔ چھریرا بدن، لمبا قد، فوجی جوانوں کی طرح سیدھی کمر، سر پہ خشخاشی بال، گھٹا ہوا سانولا رنگ، کشادہ پیشانی جس پر بیچ و بیچ نماز کا سیاہ گٹّا، لمبی ناک، لمبیں ترشی ہوئی، اچھی خاصی نوکدار لمبی سفید داڑھی جس میں دو چار سیاہ بال بھی ہیں۔ چونکہ پان بہت کھاتے ہیں اس لئے ہونٹوں کے دونوں کنارے پان کی پیک سے سرخ رہتے ہیں۔ داڑھی پر بھی پان کی ہلکی سی سرخی رہتی ہے۔ کبھی کبھی چھالیہ کا ایک آدھ دانہ بھی نظر آجاتا ہے۔ لباس بہت سادہ ہوتا ہے کسی قسم کے تکلّف سے کام نہیں لیتے۔ سر پر ململ کی ٹوپی جو رامپوری ٹوپی سے بہت ملتی جلتی ہے۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا "استاد یہ ٹوپی کس وضع کی ہے"

انھوں نے بڑے فخریہ انداز میں بتایا کہ "یہ ایجادِ بندہ ہے" اور بہت دیر اس کی خوبیوں پر روشنی ڈالی۔ مجھے وہ سب خوبیاں تو یاد نہیں رہیں البتہ اتنا یاد ہے کہ جاڑے اور گرمی کے موسم میں سر ڈھانکنے کے لئے اس سے بہتر کوئی اور چیز ممکن ہی نہیں ہے یہ ٹوپی ان کے سر پر ہمیشہ ترچھی رکھی ہوتی ہے۔ قمیض، پاجامہ جدید وضع کا لیکن بہت سادہ، گرمی، جاڑے برسات غرض ہر موسم میں انگریزی وضع کا ایک سوتی کوٹ ضرور پہنتے ہیں۔ بزرگوں سے سنا ہے جب استاد نے یہ کوٹ خریدا تھا تو اس کا ہلکا خاکی رنگ تھا۔ پیروں میں عام طور پر باٹا کا براؤن فلیٹ اور کبھی کبھی چپلیں، سیدھے ہاتھ میں ہمیشہ طے کیا ہوا اخبار جس میں لکھنے پڑھنے کی ضرورت کا پورا سامان ہوتا ہے مہینے دو مہینے میں یہ اخبار بدل دیا جاتا ہے۔ الٹے ہاتھ میں ایک بید ہوتی ہے جسے استاد گفتگو کے دوران زور زور سے زمین پر مارتے رہتے ہیں۔ استاد ساٹھ پینسٹھ کے پیٹے میں ہونگے مگر چال ایسی ہے جیسے "کڑی کمان کا تیر"۔

استاد دنیا میں بالکل تنہا ہیں۔ کوئی آگے نہ پیچھے۔ بیوی بچوں کا بوجھ تو کبھی ان کے کاندھوں پر رہا ہی نہیں، ایک ضعیف والدہ تھیں، کچھ عرصہ ہوا ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ اس لئے ان پر وہ مثل صادق آتی ہے "جورو نہ جاتا اللہ میاں سے ناتا"۔ وہ روزے نماز کے بہت پابند ہیں، نماز کے وقت کہیں بھی ہوں نیت باندھ لیتے ہیں۔ جوانی کے بارے میں تو مجھے کچھ علم نہیں لیکن اس عمر میں اخلاقی اعتبار سے بہت نیک اور شریف ہیں۔ دلّی میں دو قابل احترام ہستیاں اپنی پارسائی کی وجہ سے بہت بدنام ہیں۔ تلوک چند محروم اور بشیشور پرشاد منور لکھنوی

ان حضرات کے متعلق مشہور ہے کہ کسی جام صہبا کو ان کے لبوں سے ٹکرانے کی سعادت نصیب نہیں ہوئی اور کسی کافر ادا کو اُن کے خرمنِ دل پر بجلی گرانے کا شرف حاصل نہیں ہوسکا۔ میں استاد کو اس صف میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کبھی ان کے منہ سے کسی حسین کا ذکر نہیں سنا۔ رہی شراب، اس کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

استاد کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی پارسائی کو کسی کے لئے مصیبت نہیں بننے دیتے۔ ورنہ اس عمر میں اگر کوئی روزے نماز کا پابند ہو تو قوم کے لئے مصیبت بن جاتا ہے۔ جہاں کوئی نوجوان پھنسا اور اس نے دوزخ سے ڈرانا شروع کیا۔ استاد کبھی کسی کو نصیحتوں سے پریشان نہیں کرتے۔ البتہ خود ہر ممکن پابندی کرتے ہیں۔ ان کی جتنی محدود آمدنی ہے اتنے ہی محدود اخراجات پہلے باقاعدگی سے کچھ دوائیں۔ سر میں ڈالنے کا تیل اور کریم وغیرہ بناتے جو ان کے دوست آشنا اور شاگرد وغیرہ خرید لیا کرتے تھے مگر اب تو بہت دن سے یہ سلسلہ بھی بند ہے۔ چونکہ استاد کماتے دھماتے کچھ ہیں نہیں اس لئے دن بھر اپنے شاگردوں کے ساتھ نظر آتے ہیں۔

چنڈو خانہ دہلی کا سب سے اہم ادبی مرکز ہے۔ اس لئے مناسب ہوگا کہ مختصر سے الفاظ میں اس کا بھی تعارف کرا دوں۔ جامع مسجد کی مشرقی دیوار کے نیچے چھوٹی چھوٹی دکانیں ہیں۔ ان میں سے دو ایک کو ملا کر ایک چائے خانہ بنا لیا گیا ہے۔ کہتے ہیں جب مالک نے یہ چائے خانہ کھولا تھا تو اس پر "فرینڈز ہوٹل" کا بورڈ لگایا تھا۔ مگر کچھ ہی دن میں اس کا نام "چنڈو خانہ" پڑ گیا۔ مالک کے بار بار

احتجاج اور غم و غصّہ کے باوجود اس نام کو اتنی شہرت حاصل ہوئی کہ مالک کو شکست تسلیم کرنی پڑی۔ اب وہ بھی اپنے چائے خانہ کو "چنڈو خانہ" ہی کہتا ہے۔ نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہاں بھانت بھانت کا جانور آتا ہے۔ ہر شخص ہر شخص کی بات کا جواب دینا ضروری سمجھتا ہے۔ خواہ بات کسی سے بھی کہی گئی ہو۔ دو آدمی چنڈو خانے کے ایک سرے پر بیٹھے گفتگو کر رہے ہیں ان میں سے کسی نے کوئی بات کہی جس کا جواب وہ شخص دے گا جو دوسرے سرے پر تنہا بیٹھا ہے اور جس کی ان دونوں سے جان پہچان تک نہیں ہے۔ دنیا کا کوئی ایسا موضوع نہیں جس پر یہاں بحث نہ ہو۔ مالک کے بار بار منع کرنے کے باوجود یہاں مذہب سے لیکر سیاست اور ادب تک ہر موضوع پر بحث ہوتی ہے اور اس بحث میں تمام گاہک، چنڈو خانہ کے بیرے سب برابر حصّہ لیتے ہیں۔ چائے خانہ میں داخل ہوتے ہی آپ کی نظر دیوار پر لٹکی ہوئی ایک تختی پر پڑے گی جس پر لکھا ہے "سیاسی اور بیکار گفتگو کرنا سخت منع ہے"۔ مگر کون سنتا ہے صاحب۔ یہ چنڈو خانہ اردو ہندی کے بعض ادیبوں اور شاعروں کا گڑھ ہے۔ یہاں آنے والوں کی تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو شام کو آتے ہیں۔ یہ عام طور پر سرکاری دفتروں میں ملازم ہیں اس لئے مجبور ہیں۔ دوسرے وہ لوگ جو گھر سے کسی وقت اور کسی کام سے نکلے یہاں ٹھیکی لئے بغیر نہیں جائیں گے۔ تیسرے وہ صاحبان ہیں جو صبح نو بجے یہاں آجاتے ہیں اور رات کو دو بجے مالک انھیں نکالتا ہے۔ ان حضرات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ گردشِ ایام کا ان پر کوئی اثر نہیں۔ غمِ جاناں، غمِ روزگار انھیں چھو کے نہیں گیا۔ اور فارسی کا یہ شعر اس حریم بزمِ مستاں پر صادق آتا ہے ؎

در حریم بزمِ مستاں دور صبح و شام نیست　　گردشِ جام است ایں جا گردشِ ایام نیست

دہلی میں جب کوئی مشاعرہ ہوتا ہے تو منتظمین یہاں پہنچ کر خاصے بیس پچیس شاعر گھیر کرلے جاتے ہیں۔ یہاں آنے والے بزرگوں میں بسمل سعیدی، انور صابری، منشی عبد القدیر، غلام احمد فرقت، خان غازی کابلی، گوپال متل وغیرہ اور نوجوانوں میں مخمور سعیدی، گلزار دہلوی، اسلم پرویز، مہیش چندر نقش، رشید حسن خاں، رعنا جگی، نریش کمار شاد، انور کمال حسینی، بہار الہ آبادی، بہار برنی، عزیز وارثی، رام کرشن مضطر اور رمیش گوڑ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

اس چنڈو خانے میں ہر طرح کی گفتگو ہوتی ہے۔ جامع مسجد کے کاروباری بڑے بڑے سودے طے کرتے ہیں۔ کبوتر باز کبوتروں کی خرید و فروخت کرتے ہیں مشاعرے میں جانے کے دام ہوتے ہیں ہندوستان اور پاکستان کے مشہور شاعروں کے کلام پر تنقید اور لعن طعن ہوتی ہے، غیر حاضر شاعر کے کلام اور شخصیت کی صرف خرابیوں پر تفصیلی روشنی ڈالی جاتی ہے۔

معاف کیجئے گا میں نے چنڈو خانے کی تفصیل ذرا زیادہ ہی بیان کردی بات دراصل یہ ہے کہ اس کے بغیر استاد کی شخصیت و سیرت کا بیان ممکن ہی نہیں تھا۔ استاد شام کو یہاں اس وقت آتے ہیں جب آس پاس کی دکانیں بند ہو جاتی ہیں — ان کے ساتھ شاگردوں کی پوری کھیپ ہوتی ہے۔ چنڈو خانے کے برابر ایک دکان کے تختے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے ہیں، شاگرد قریب کی دکانوں کے آگے رکھے ہوئے سٹول مونڈھے اور بنچیں اٹھا لاتے ہیں اور باقاعدہ محفل لگ جاتی ہے۔ شاگردوں کے کلام پر اصلاح، گذرے ہوئے مشاعرے کے واقعات پر تبصرہ، ہونے والے مشاعرے کے متعلق گفتگو وغیرہ ہوتی ہے۔ اس دوران میں اگر کوئی ایسا شاعر آتا ہے

جو استاد کی ٹکڑی کا نہیں ہے تو چینڈو خانے میں داخل ہونے سے پہلے وہ استاد کے پاس جائے گا، دعا سلام ہو گی۔ اگر شاگرد نے تازہ غزل کہی ہے یا کسی شاگرد کو استاد نے تازہ غزل دی ہے تو وہ سنے گا ورنہ دو چار منٹ بیٹھ کر داخل چینڈو خانہ ہو گا۔ اسی طرح واپسی میں چنگی دے کر جائے گا۔ استاد بہت کم خوراک ہیں شام کو عام طور پر روپے کا ایک بڑا بسکٹ اور ایک پیالی دودھ۔ کوئی بھی شاگرد ان پر یہ لاگت لگا دیتا ہے۔ باقی وقت چائے چلتی ہے چائے کا آرڈر عام طور پر ان کے شاگرد دیتے ہیں کبھی کبھی استاد خود بھی چائے کے پیسے دیدیتے ہیں۔ استاد کو اپنے شاگرد بہت عزیز ہیں ان میں ہندو مسلمان، سکھ سب مذہب کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کی تربیت میں استاد کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے، اگر پوری کوششوں کے باوجود کوئی شاگرد ایک مصرع بھی موزوں نہیں کر پاتا تو مجبوراً اپنی کہی ہوئی غزلیں اس کو دیتے ہیں۔

مشاعرے میں ہمیشہ پوری فوج لیکر پہنچتے ہیں، سٹیج سکریٹری کو وہ خود ہدایت دیتے ہیں کہ وہ اور ان کے شاگرد کس ترتیب سے بیٹھیں گے وہ دراصل اچھے ترنم والے، بُرے ترنّم والے اور تحت اللفظ پڑھنے والے شاگردوں کے لحاظ سے ترتیب قائم کرتے ہیں۔ مشاعرہ ان کی زندگی میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ بڑی احتیاط سے پٹھے لڑاتے ہیں، اگر پٹھے نے بقول ان کے مشاعرہ پیٹ لیا یا لوٹ لیا تو سہرا ان کے سر، اور اگر ناکام ہوا تو منتظمین کی ماں کی ..... جن کی وجہ سے ان کی سبکی ہوئی۔

انہیں شاگردوں کی خاطر استاد ہر اس مشاعرے میں جاتے ہیں جس میں انھیں بلایا جاتا ہے چونکہ شاگردوں کی مالی استعداد اچھی نہیں ہے اس لئے مشاعرے

یں پہنچتے ہی استاد منتظمین کو بلاتے ہیں اور ٹیکسی کے نام پر سب شاگردوں کو دو، دو، یا تین تین روپے دلواتے ہیں۔ دو چار دفعہ استاد کو مشاعروں میں بڑے تلخ تجربات بھی ہوئے۔ ایک دفعہ دہلی سے کچھ میل دور انہیں اور ان کے شاگردوں کو مدعو کیا گیا، گاڑیاں لینے آئیں، استاد پہنچ گئے مشاعرہ جم کے ہوا لیکن رات کو دو تین بجے جب مشاعرہ ختم ہوا تو معلوم ہوا کہ منتظمین میں سے کوئی بھی وہاں موجود نہیں ہے۔ بہت تلاش کیا کوئی ہاتھ نہ آیا، مجبوراً پیدل چلنا پڑا، برسات کا موسم، اندھیری رات، کچا راستہ، استاد اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے، بھیگتے بھاگتے، کیچڑ میں لت پت صبح کے قریب دلّی پہنچے۔ کئی دن تک اس واقعہ کا چرچا رہا۔ جو کوئی ملتا استاد یہ واقعہ ضرور سناتے ایسا دلچسپ قصہ اور پھر بیان استاد کا لطف ہی تو آگیا۔

ایک دفعہ تو واقعی حد ہوگئی۔ کچھ لوگ استاد کو غازی آباد سے آگے کسی مقام پر مشاعرے میں لے گئے، آدھی رات گئے جب مشاعرہ ختم ہوا تو معلوم ہوا کہ جو ٹیکسیاں ان کو لیکر آئی تھیں وہ واپس چلی گئیں۔ استاد نے منتظمین کو آڑے ہاتھوں جو لیا تو گھبرا گئے۔ کچھ دیر بعد ایک صاحب آئے اور بولے چلیئے آپ کو بس میں بٹھا دیں۔ استاد نے خدا کا شکر ادا کیا اور مع اپنے شاگردوں کے ساتھ ہو لئے۔ مشاعرہ ہال سے کچھ دور ہی بس کھڑی تھی، وہ صاحب استاد کو اس میں بٹھا کر چلے گئے۔ آدھا گھنٹہ، گھنٹہ بھر ہوا۔ کوئی سواری آتی ہے، ڈرائیور آتا ہے نہ بس چلتی ہے۔ دو بجے سے بیٹھے بیٹھے چار بج گئے۔ بس چلنے کے آثار ہی نہیں اتفاق سے کوئی راہگیر ادھر سے گذرا۔ استاد نے اس سے پوچھا کہ صاحب یہ بس کب چلے گی؟ وہ صاحب ہنسنے لگے۔ استاد نے پھر سنجیدگی سے وہی سوال دہرایا، ان صاحب نے قہقہہ لگا کر فرمایا کہ یہ

بس تو مہینوں سے یہاں کھڑی ہے، دیکھ لو پچھلے دونوں پہیئے اینٹوں پر رکھے ہیں۔ بھنّا ہی تو گئے استاد۔ لپکے مشاعرہ ہال کی طرف۔ وہاں کیا رکھا تھا۔ گھپ اندھیرا، آدم نہ آدم زاد، گئے تھے اپنی کو پڑ گئے گھسیٹن میں۔ جنوری کے کڑکڑاتے جاڑے، اجنبی راستہ، کوئی راہ بتانے والا نہیں۔ آٹھ دس میل گرتے پڑتے پیدل چل کر غازی آباد کے اسٹیشن پر آئے اور صبح کو دلّی پہنچے۔

استاد خود جب مشاعرے میں غزل پڑھتے ہیں تو چھتیں اڑنے لگتی ہیں۔ ایک تو استاد کا کلام، کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی زبان، دلّی کے محاورے، سونے پر سہاگہ، داغ کی معاملہ بندی اور سب سے بڑھ کر پڑھنے کا دلچسپ انداز۔ وہ مائیک کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھتے ہیں، پہلے مصرع کے درمیان سے زمین سے اٹھنا شروع کر دیتے ہیں اور دوسرے مصرع کے اختتام تک فٹ بھر زمین سے اٹھ چکے ہوتے ہیں اور ردیف پر پہنچ کر دانت بھینچ کر ایسے زور سے زانوؤں پر دوہتڑ مارتے ہیں کہ اگر ایسے ویسے کی رانیں ہوں تو زمین سے نہ اٹھ سکے۔ استاد ہاتھ، آنکھیں، ابرو، ہونٹ، دانت غرض ہر چیز سے کام لیتے ہیں۔ بعض اشعار پڑھتے ہوئے تو بالکل یہ معلوم ہوتا ہے کہ محبوب کے سامنے بیٹھے عرض حال کر رہے ہیں۔ مثلاً جب وہ یہ شعر پڑھیں گے ؎

ہاتھ ٹوٹیں میں نے جو چھیڑی ہوں زلفیں آپ کی
آپ کے سر کی قسم دستِ صبا تھا میں نہ تھا!

پہلے مصرع کے ابتدائی الفاظ بڑی عاجزی اور انکساری سے اٹھائیں گے اور پھر مصرع کے ختم پر پہنچتے پہنچتے زمین سے کافی اٹھ جائیں گے، آواز کانپنے لگے گی، اور دوسرا مصرع پڑھتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑ لیں گے، آواز میں کپکپاہٹ بہت زیادہ

پیدا ہو جائے گی۔ پھر اس طرح ڈرتے ہوئے پیچھے ہٹیں گے جیسے محبوب بہت قریب ہے اور اس کے ہاتھ میں تلوار نہیں تو ڈنڈا ضرور ہے۔ چونکہ شعر کی ادائیگی میں استاد مکمل تصویر بن جاتے ہیں۔ جس سے شعر کا اثر دو گنا ہو جاتا ہے۔ اس لئے دہلی کے کالجوں کے مشاعروں میں انھیں بہت مقبولیت ہے۔

استاد کو اس پر ناز ہے اور بجا ناز ہے کہ وہ اہل زبان ہیں۔ زبان ان کے گھر کی لونڈی ہے۔ اس معاملے میں استاد کسی رُو رعایت کے قائل نہیں جامع مسجد چتلی قبر اور کوچہ چیلان کے رہنے والے اہل زبان ہیں اور دہلی کے باقی علاقوں کے لوگ ان کے نزدیک FOREIGN COUNTRY کے رہنے والے ہیں جن کا اردو سے کوئی تعلق نہیں۔ اور دہلی سے باہر والوں کا تو خیر کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ایک فن ایسا بھی ہے جس میں دلّی تو کیا پورے برصغیر میں ان کا ثانی مشکل سے ملے گا۔ اور وہ ہے گالیاں دینے کا فن۔ یوں تو سبھی گالیاں دے لیتے ہیں، آپ نے بازاری آدمیوں سے سینکڑوں گالیاں سُنی ہونگی مگر استاد جیسی ہنرمندی اور سلیقہ شعاری کسے نصیب ہو سکتی ہے، وہ سڑی سے سڑی گالی کو اس حسین انداز میں بیان کریں گے معلوم ہو گا کہ منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ انسانوں کے آپس میں ایسے ایسے عجیب رشتے اور پھر بعض حیوانوں کے انسانوں سے تعلقات بیان کریں گے جو کبھی آپ کے تصوّر میں بھی نہیں آسکتے۔ اُن کی گالیاں سن کر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر آدمی کو گالیوں پر پوری قدرت حاصل ہو جائے اور خدا ان کے استعمال کی توفیق بھی دیدے تو قوتِ اظہار کم از کم دس گنی ہو جاتی ہے اور بہت سے خیالات تو ایسے ہیں جنکا اظہار گالیوں کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ زندگی میں ایک دو نہیں

کئی مقام ایسے آتے ہیں جب انسان کو اپنے خیالات کے اظہار پر قدرت نہیں رہتی وہ خود پر غصہ ہوتا ہے، جھنجھلاتا ہے مگر کچھ کر نہیں سکتا۔ میری زندگی میں جب کوئی ایسا موقع آتا ہے تو بیساختہ استاد یاد آتے ہیں۔ کاش مجھے بھی استاد کا فن آتا!

استاد بڑے خوددار ہیں اور یہ خودداری غلو کی حد تک ہے۔ اپنے آگے کسی کو نہیں گردانتے، دوسرے وہ زود رنج بہت ہیں، بہت جلدی غصہ ہو جاتے ہیں لیکن من بھی جلد جاتے ہیں۔ غالبؔ کی گل افشانیٔ گفتار اس وقت ہوتی تھی جب کوئی انکے آگے پیمانہ وصہبا رکھ دیتا تھا مگر استاد تو شیشۂ مے کی طرح ہر وقت بھرے بیٹھے رہتے ہیں، ایک ذرا چھیڑ دیجئے پھر دیکھئے بس اتنا کہنا کافی ہے استاد رات مشاعرے میں آپ کی کامیابی سے فلاں بہت جل رہا تھا۔ یا استاد فلاں آپکے شعر پر یہ اعتراض کر رہا تھا۔ بس استاد کا ناریل چٹخ جاتا ہے اور ایسا جلال آتا ہے کہ چھوٹے بڑے، امیر غریب، شریف رذیل کسی میں فرق نہیں کرتے۔ بقول ان کے وہ کسی سے بودے نہیں کسی کے دبیل نہیں۔ پھر کیوں کسی سے دبیں۔ بھرّے پر چڑھتے ہی ایسی مغلّظات سنانی شروع کریں گے کہ توبہ ہی بھلی۔ اب گویا اعتراض کرنے والے سے ٹھن گئی۔ مستقل مورچہ بن گیا۔ ان دنوں کہیں ملیئے مخالف پر گالیاں پڑ رہی ہونگی، کچھ دن بعد استاد اس مخالف کے شجرہ نسب سے متعلق نئے نئے انکشافات کریں گے جن سے خود اس مخالف کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔ وہ جس سے لپٹتے ہیں جھاڑ کا کانٹا ہو کر۔ میں نے اُن کے کئی معرکے دیکھے ہیں۔ اکثر ان کے مخالف کو چین بولتے دیکھا۔ جب جھگڑا ہوتا ہے تو وہ ہر ممکن حربہ استعمال کرتے ہیں۔ وہ دلّی والے ہیں اس لئے یو۔ پی کا ہونا عیب ہے۔ وہ جامع مسجد کے پاس رہتے ہیں اس لئے باڑہ ہندو راؤ والے کی زبان

غیر مستند ہے وہ سیّد ہیں اس لئے غیر سیّد کو جینے کا حق نہیں ہے۔ لیکن ملاپ ہونے پر ان میں سے کوئی چیز عیب نہیں ہے۔

ایک دفعہ میں بھی استاد کا شکار ہو چکا ہوں۔ ہوا یہ کہ ہمارے کالج سے نظموں کا ایک انتخاب شائع ہو رہا تھا میں نے استاد سے بھی ایک قطعہ لے لیا۔ وہ نیم مزاحیہ تھا، جب انتخاب کی ترتیب سے متعلق کالج میں میٹنگ ہوئی تو یہ تجویز پیش کی گئی کہ مزاحیہ نظمیں شامل نہ کی جائیں۔ سب ممبروں نے یہ تجویز منظور کرلی۔ مگر مجھے تامّل تھا اور بات صرف یہ تھی کہ میں جانتا تھا کہ کتاب چھپی اور استاد کا قطعہ نہ ہوا تو میں جامع مسجد تو جا نہیں سکتا۔ اور مصیبت یہ ہے کہ میرا گھر وہیں ہے۔ میری بہت مخالفت کے باوجود یہ تجویز منظور کرلی گئی۔ کتابت کے بعد ایک نظم کے نیچے آدھا صفحہ بچ گیا، چونکہ استاد کا قطعہ دلچسپ تھا میں نے دے دیا۔ کتاب چھپ کر آئی، میں نے استاد کی خدمت میں پیش کی، وہ بہت سادہ دِل آدمی ہیں، بہت خوش ہوئے۔ دوسرے دن جو جامع مسجد جاتا ہوں تو نقشہ ہی بدلا ہوا ہے جو شخص ملتا ہے یہی اطلاع دیتا ہے کہ استاد بہت گالیاں دے رہے ہیں۔ بھئی میرا قصور؟ جواب ملا ایک تو قطعہ آدھے صفحے پر دیکر اس کی اہمیت کم کی اور دوسرے نام کے ساتھ سیّد نہ لکھ کر گویا استاد کی سادات سے تحریری طور پر انکار کیا۔ سمجھ گیا کہ لوگ مجھ سے تفریح لے رہے ہیں۔ میں استاد کو کتاب دیکر آیا ان کے ہم نشینوں سے انھیں چڑھا دیا۔ یا اللہ اب کیا ہوگا؟ دو چار دن میں وہ میرا شجرۂ نسب بھی نکال لائیں گے دوستوں نے مشورہ دیا خود جاکر صفائی کرلو ورنہ بیچ والے کوئی کمی نہ چھوڑیں گے۔ گیا استاد کے پاس۔ حسبِ معمول چنڈو خانے کے برابر دوکان کے پٹڑے پر بیٹھے تھے۔ میری کتاب ہاتھ میں تھی اور گل افشانیاں ہو رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی تیوری پر بل پڑ گئے میں نے

مودبانہ سلام کیا، صرف گردن کو جھٹکا دیکر جواب دیا۔ تیوری پر بل بدستور رہے۔ میں نے
ناراضگی کی وجہ پوچھی خاموش بیٹھے رہے۔ استاد میرے چچا میاں کے دوستوں میں ہیں۔
اس لئے مجھ سے محبت کرتے ہیں اور بھتیجا کہا کرتے ہیں۔ مگر یہ معاملات ایسے ہیں جن
میں استاد کسی کو نہیں بخشتے تھے، اس لئے میرے پیچھے استاد نے جو نہ سنائیں تھیں
سنائیں۔ میں نے خود بات شروع کی۔ "استاد اس کی ترتیب ہمارے کالج کے پرنسپل
ڈاکٹر سروپ سنگھ کی ہے۔ میرا تو صرف اس پر نام ہے۔ ورنہ میں ایسی گستاخی کر سکتا
ہوں"۔ یہ سنتے ہی استاد پھٹ پڑے اور شاگردوں سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے "میاں
میں خود کہتا تھا میرا بھتیجا ایسا نہیں کر سکتا۔ یہ حرامی پن کسی اور کا ہے"۔ اور استاد نے
گالیوں کا رخ ڈاکٹر سروپ سنگھ کی طرف کر دیا۔ اس سے قبل وہ ڈاکٹر صاحب کی ادب نوازی
کی وجہ سے ان کی بہت عزّت کرتے تھے مگر اب سب بالائے طاق تھا جب ان کی
بھڑاس نکل گئی تو میں نے سمجھانا شروع کیا اور خدا کا شکر ہے آدھے گھنٹے میں استاد
مان گئے۔ اور انھیں ڈاکٹر صاحب اور مجھ سے کوئی شکایت نہیں رہی۔

ان گالیوں کے سلسلے میں بہت سے دلچسپ قصّے بھی ہوئے ہیں۔ ایک دو
سُن لیجئے۔

ایک دفعہ چنڈو خانے میں بیٹھے استاد یو، پی کی ایک ریاست کے لوگوں کو بے نقط
سنا رہے تھے۔ دس پندرہ منٹ گذر گئے اور استاد کی گل افشانی جاری رہی برابر کی
میز پر ایک اجنبی صاحب خاموشی سے سب کچھ سنتے رہے۔ اچانک فرمانے لگے۔
"صاحب میں بھی اس ریاست کا ہوں، ہم لوگوں نے آپ کا بگاڑا کیا ہے؟" اس
ناگہانی افتاد سے گھبرا گئے استاد مگر فوراً بات سنبھال لی۔ فرمانے لگے "میاں عوام تو

سب جگہ ایک ہی سے ہوتے ہیں۔ ہم ہیں اور آپ میں کیا فرق۔ میں تو وہاں کے نواب کو گالیاں دے رہا ہوں جو بیچارے مظلوم عوام پر ظلم کرتا ہے۔" (حالانکہ ریاستیں ختم ہونے کے بعد سے نواب کا ریاست سے کوئی تعلق نہیں) بارے بات سنبھل گئی اور وہ صاحب بظاہر مطمئن سے ہو گئے۔

ایک دفعہ ہندوستان کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے استاد پٹھانوں کو مَن مَن بھر گالیاں دے رہے تھے۔ میں خاموش بیٹھا سنتا رہا۔ اچانک استاد کو اپنی غلطی کا احساس ہوا یعنی انھیں یہ خیال آ گیا کہ میں بھی پٹھان ہوں۔ فوراً بات بدل دی "میاں سب پٹھان ایک سے تھوڑے ہوتے ہیں ان میں کچھ ایسے شریف اور نیک بھی ہوتے ہیں جن کے آگے سیّد بھی کچھ نہیں اب جیسے میرا یہ بھتیجا ہے اس کے خاندان کے کسی فرد سے ملئے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں سے ملاقات ہو رہی ہے۔" (حالانکہ استاد کی میرے خاندان کے بارے میں ایمانداری سے یہ رائے نہیں ہے)

استاد نے برسوں سیاست میں حصہ لیا ہے، وہ کسی بھی میدان میں اپنے حریف کو برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ کانگریسی تھے، اس لئے اکثر غیر کانگریسیوں سے معرکے ہوئے۔ سنا ہے جامع مسجد پر اچھے خاصے لیڈر استاد سے کتراتے تھے۔ ایک دفعہ کسی کا سرِ بازار گریبان پکڑ لیا۔ ایک دفعہ کسی کے سر پر کریم کی شیشی ایسی کھینچ کر ماری کہ سر پھٹ گیا۔ ایک دفعہ ایک تحصیلدار کو پیٹ دیا۔ کچہری عدالت ہوئی، برسوں مقدمہ چلا جیت استاد کی ہوئی۔ آزادی کے بعد بہت سے ابن الوقت کانگریس میں شریک ہو گئے لیکن ایسے زور شور کے کانگریسی ہوتے ہوئے بھی وہ سیاست سے کنارہ کش ہو گئے۔

دس پانچ دشمن تو سب کے ہی ہوتے ہیں۔ استاد چونکہ اونچ نیچ کی بات کرتے نہیں۔ ذرا کسی سے ناراض ہوئے اور شروع ہوئی گالیوں کی بوچھاڑ۔ چنانچہ ان کے مخالف ذرا زیادہ ہی ہیں۔ استاد کہتے ہیں اصل نسل سیّد ہوں۔ مخالفین کہتے ہیں کہ ان کا سادات سے کوئی تعلق نہیں۔ استاد کہتے ہیں میں خواجہ میر دردؔ کے خاندان سے ہوں، دشمن کہتے ہیں ان کا خواجہ میر درد سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ استاد کو اس پر فخر ہے کہ وہ جانشین بیخودؔ ہیں۔ حریف کہتے ہیں جانشین ہونا تو دُور کی بات ہے استاد کو اُن سے تلمّذ بھی نہیں رہا۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ کون ٹھیک کہتا ہے۔ ہم تو ان معاملوں میں استاد کے طرفدار ہیں۔ وہ کاہے کو جھوٹ بولیں گے۔

استاد کا بات کرنے کا انداز بہت دلچسپ ہے معمولی سی بات کو ایسی ایسی تشبیہات و استعارات کے پردے میں بیان کرتے ہیں کہ لطف آجاتا ہے۔ ایکدفعہ استاد اپنے شاگرد کے متعلق فرما رہے تھے۔ "میاں شعر کہنا تو کجا سالے کو بات کرنے کی تمیز نہیں تھی، سارا زور لگایا، سالے نے ایک مصرع نہ جَن کے دیا۔ مجبوراً میں نے اپنی غزلیں دیں، آواز اچھی تھی چل نکلے مشاعروں میں...... اب جو پَر نکلے تو جا بیٹھا فلاں کی چھتری پر" (استاد کے شاگرد نے کسی اور کا تلمّذ اختیار کر لیا تھا اس شاعر نے پہلے بھی استاد کا ایک شاگرد توڑ لیا تھا)

ایک دفعہ استاد کے ایک شاگرد نے ایک بڑے غزل گو کا تلمّذ اختیار کر لیا۔ اس شاعر کا تعلق ایک صوفی خاندان سے تھا اور بڑے غزل گو ۱۹۴۷ء سے قبل ایک رجواڑے میں رہتے تھے، استاد اس شاگرد کو سمجھاتے ہیں، "ابے کس کے چکر میں آگیا انھوں نے تو بڑی بڑی ریاستیں چٹ کر لیں اور تیرا باپ تو ایک ٹوٹی پھوٹی قبر چھوڑ

کرمرا ہے"۔ یہ فقرہ بہت مقبول ہوا۔ بہت دن تک لوگوں کی زبان پر رہا خود وہ غزلگو بھی ان الفاظ سے لطف اٹھاتے رہے۔

ایک دفعہ استاد کی ایک جوان شاعر سے چھڑی اور ایسی چھڑی کہ تراہ تراہ مچ گئی۔ جب بات حد سے گذر گئی تو کچھ لوگ اکھٹا ہوئے اور دونوں کو بلایا تاکہ ملاپ کرادیں، استاد نے پہلا فقرہ ہی یہ کہا "صاحبو اگر یہ سچے دل سے صلح صفائی کرنا چاہتے ہیں تو میں بھی حاضر ہوں اور اگر کوئی لمبا حرامی پن ہے تو صاف بتادیں" لمبا حرامی پن کی ترکیب ملاحظہ ہو۔

ایک دفعہ استاد بہت دن سے بیمار تھے۔ جامع مسجد کے قریب بہت سے حکیموں سے علاج کرایا افاقہ ہونا تو کجا مرض اور بڑھ گیا۔ ایک دن سرراہے استاد سے ملاقات ہوئی میں نے مزاج پوچھا فرمانے لگے "بھتیجے اہل دلّی کو بالعموم اور میرے خوردوں کو بالخصوص واضح ہو کہ جامع مسجد سے لیکر کمرہ بنگش تک جتنے حکیم بنے بیٹھے ہیں ان میں کوئی حکیم نہیں ہے سب سالے عطائی ہیں"۔ پھر استاد نے ان حکیموں کی خوبیاں اپنی بیماری اور علاج مخصوص زبان میں بیان کیں، لطف ہی تو آگیا۔

چند سال ہوئے استاد نے بیخود اکیڈمی بنائی تھی، اگرچہ وہ خود کو اس اکیڈمی کا صرف جنرل سکریٹری لکھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اس میں اور کوئی عہدہ دار نہیں ہے۔ اکیڈمی کا دوسرا نام اب استاد رسا ہے۔ اکیڈمی کا سال میں صرف ایک فنکشن ہوتا ہے اور وہ ہے "یوم بیخود" پر سالانہ مشاعرہ۔ سال بھر استاد کے موضوعاتِ گفتگو میں ایک موضوع یہ مشاعرہ بھی رہتا ہے۔ شروع کے چھ مہینے گذرے ہوئے مشاعرے کے واقعات، مشاعرے کی کامیابی اور اس کامیابی سے دشمنوں کی

شکست پر تبصرہ ہوتا ہے، باقی چھ مہینے آنے والے مشاعرے کی تیاریوں کے متعلق گفتگو میں صرف ہوتے ہیں۔ ایک مہینہ قبل استاد لنگوٹ باندھ کر میدان میں آجاتے ہیں۔ دلّی کے تمام گلی کوچوں میں دلچسپ اشتہار لگنا شروع ہوتے ہیں۔ جن کے عنوانات کچھ اس قسم کے ہوتے ہیں۔ "شاندار مشاعرہ" "عالیشان مشاعرہ" "بڑا مشاعرہ" "عظیم مشاعرہ" وغیرہ وغیرہ۔ اشتہار میں یہ بھی اطلاع دی جاتی ہے کہ اچھا کہنے والے اور اچھا پڑھنے والے شاعر شرکت کر رہے ہیں۔ اشتہار کے آخر میں استاد کا نام اس طرح ہوتا ہے "کفش بردارِ بیخود رفیقِ اربابِ سخن جنرل سکریٹری بیخود اکیڈمی" یہ اشتہار دس دس دن کے فاصلے سے لگائے جاتے ہیں۔ اور آخری اشتہار مشاعرے سے ایک دن قبل لگایا جاتا ہے جو اخباری سائز کا ہوتا ہے۔ کچھ حاسد اور استاد کی کامیابی سے جلنے والے بڑے اوچھے ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ بعض اشتہارات میں کالی سیاہی سے "رسا" کی "س" پر تشدید لگا کر رسّا کر دیتے ہیں۔

اس ایک مہینے میں استاد اپنے شاگردوں، دوستوں معتقدوں اور ڈرنے والوں سے کچھ رقم جمع کرتے ہیں جو سو ڈیڑھ سو سے زیادہ نہیں ہوتی۔ جبکہ خرچ کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ چونکہ سارا کام استاد کو خود کرنا پڑتا ہے اس لئے ایک ہفتے پہلے سے انہیں دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہیں رہتی، وہ خود اشتہار لگاتے ہیں۔ خود مشاعرے کی خبریں تمام اخباروں کے دفتروں کو پہنچاتے ہیں۔ یہ مشاعرے جامع مسجد کے سنگھاڑے میں ہوتے ہیں اس لئے میونسپل کارپوریشن سے اجازت لیتے، دریاں چاندنیاں تخت اور لاؤڈ سپیکر وغیرہ کا انتظام کیا جاتا ہے، یہ ساری بھاگ دوڑ پیدل ہوتی ہے۔ مشاعرے کے دن صبح کی نماز پڑھ کر استاد سنگھاڑے میں آجاتے ہیں کاغذ کی جھنڈیوں

اور پھولوں سے میدان سجایا جاتا ہے۔ ایک خوبصورت ڈائس بنتا ہے شام ہوتے ہی چھڑ کاؤ ہوتا ہے استاد خود دریاں چاندنیاں بچھاتے ہیں کبھی کبھی ایک دو شاگرد بھی ان کی مدد کو آجاتے ہیں۔ مغرب کے وقت تک ہر چیز تیار ہو جاتی ہے روشنیوں اور پھولوں سے میدان دلہن کی طرح سج جاتا ہے۔ نو بجے مشاعرہ شروع ہوتا ہے، مشاعرے کے دوران میں استاد ایک منٹ کے لئے ٹک کے نہیں بیٹھتے۔ کسی شاعر کو پان پیش کیا جا رہا ہے کسی کو سگرٹ دیا جا رہا ہے کوئی روٹھ گیا ہے اُسے منایا دو چار لونڈے اگلی صفوں میں آگئے ہیں انھیں اٹھایا جا رہا ہے (ضرورت پڑنے پر ایک آدھ بید بھی جما دی جاتی ہے) کسی کونے سے داد کم دی جا رہی ہے، وہاں جاکر لوگوں کو کم فہم اور سخن ناشناس کہکر ان کی غیرت کو جگایا جا رہا ہے۔ غرض استاد بجلی کی طرح تمام مشاعرے میں کوندتے پھرتے ہیں۔ اللہ اللہ کر کے رات کو تین چار بجے مشاعرہ ختم ہوا دری چاندنیاں سمٹتے سمٹتے صبح ہو گئی استاد نے جامع مسجد میں نماز پڑھی۔ مشاعرے کی کامیابی کا شکرانہ ادا کیا۔ اور چنڈو خانے میں آکر بیٹھ گئے۔ سب لوگ رات بھر کے جاگے ہوئے گھروں میں بے سدھ سو رہے ہیں اور استاد چنڈو خانے میں بیٹھے ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ دس بجے کے قریب لوگ آنا شروع ہوئے ہر آنے والا انھیں مبارک باد دے رہا ہے، استاد خاکساری سے مسکرا رہے ہیں۔ استاد مشاعرے کو اپنے دوستوں کی شکست سمجھتے ہیں اس لئے اب انھیں گالیاں دینے کا موقع ملتا ہے "میاں فلاں کے گھر میں توا چولھا اوندھا پڑا ہے، ان کی ماں کا .... کندہ ناتراش، نطفۂ ناتحقیق، ناخلف .... استاد رسا سے ٹکر لیں گے۔ لوگ سوگ منا رہے ہیں سوگ ....

اتنا سا منہ نکل آیا ہے۔" (حالانکہ انھوں نے ابھی اپنے دشمنوں کا منہ نہیں دیکھا ہے) مشاعرے کے بعد مہینوں دشمنوں پر اسی طرح گالیاں پڑتی رہیں گی۔ ایک دفعہ تو دشمنوں کی گردنیں جھکا ہی دیں۔ مشاعرے کے دوسرے دن انھوں نے رومال میں بندھی ہوئی مٹھائی کی پلیٹیں بانٹی تھیں۔ ابھی استاد زندہ ہیں ان کے دم سے جامع مسجد کے ہنگامے زندہ ہیں۔ مشاعروں میں زندگی ہے۔ خدا ان کو سلامت رکھے کہ وہ ہماری قدیم تہذیب کی آخری یادگاروں میں ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم
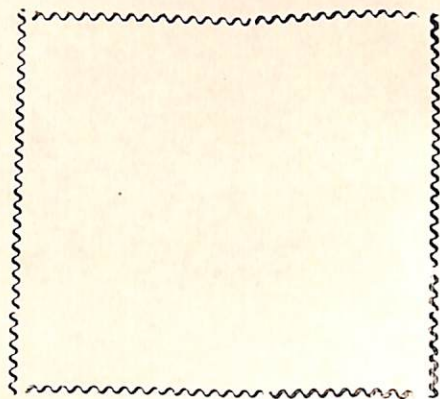
انگنا کہار

سیّد ضمیر حسن دہلوی

سیّد ضمیر حسن دہلوی

۴ر مارچ ۱۹۴۰ء کو دِلّی میں پیدا ہوئے، اینگلو عربک اسکول اور دِلّی کالج میں تعلیم پائی۔ آزادی کے بعد والدین کے ساتھ لاہور چلے گئے۔ لیکن جلد ہی خاکِ پاکِ دہلی کی محبت انھیں واپس کھینچ لائی۔

ع وہ کوچۂ دلکش جنّت ہو گھر ہے گھر پھر بھی

دِلّی کے نوجوان ادیب ہیں۔ ان کی تحریروں میں قدیم و جدید نثر کی تمام تر خوبیاں یکجا ہو گئی ہیں۔ ضمیر صاحب کو دِلّی سے والہانہ لگاؤ ہے۔ ملّا واحدی اور حضرت مولانا احمد سعیدؒ کی صحبتوں سے اکتسابِ فیض کیا ہے۔ دلی کی زبان اور ادب پر بڑی گہری نظر ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی نثر شستہ اور برجستہ محاوراتِ اہل دہلی سے مالا مال ہوتی ہے۔ ان کی کتاب "دلی سے دِلّی تک" پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر خلیق انجم نے لکھا ہے :-

"ضمیر صاحب نئی نسل کے حسّاس اور ذہین نوجوان ہیں خدا نے انھیں

زبان و بیان پر جو قدرت دی ہے وہ قوّتِ بازو سے حاصل کی جانے
والی شے نہیں ہے۔ ان کے انشائیے ٹھیٹھ دلّی کی زبان میں ہیں۔
وہ روزمرّہ کی لطافتوں اور نزاکتوں سے بخوبی واقف ہیں اور ان
اہلِ زبان میں سے ہیں جن کے لئے کتابیں، لغتیں اور اساتذہ
کا کلام سند نہیں ہوتا بلکہ وہ خود سند ہوتے ہیں ۔"

ضمیر صاحب قدیم دِلّی کے مرد، عورت، جاہل اور پڑھے لکھے سب لوگوں کی
زبان پر پورا پورا عبور رکھتے ہیں۔ وہ ایک غیر معمولی قوّتِ مشاہدہ کے مالک ہیں۔
انھیں جزئیات نگاری پر قدیم داستان گویوں کا سا ملکہ حاصل ہے۔ ان کے محاکاتی
اندازِ بیان نے ان کے خاکوں کی شخصیات کو زندہ جاوید کردار بنا دیا ہے۔
آجکل دِلّی کالج میں اُردو کے لیکچرار ہیں۔

"انگنا کہار"

میر تفضّل حسین کی کھڑکی کے پاس جو چماروں کا چھتّہ ہے اس کے قریب ہی دو تین بوسیدہ سی دکانیں اللہ بخشے، دادا ابّا مرحوم کی ملکیت تھیں۔ ان دوکانوں کو غالباً سدا سے رہائش کے لئے استعمال کیا جاتا تھا اور سچ پوچھو تو دوکانداری کا یہاں موقع بھی نہ تھا۔ بہت مختصر سی آبادی اور وہ بھی فقط ان لوگوں کی جنہیں بیشتر ضروریاتِ زندگی جنس کی شکل میں اپنے ججمانوں کے گھروں سے مل جاتی تھیں پھر ایک اور بات یہ کہ جگہ بھی کچھ اندھیری اندھیری سی تھی خوفناک، ہم جیسے کمزور دل آدمی کو اگر کوئی لاکھ روپیہ بھی دے تو سچ جانو جھٹپٹے کے بعد ادھر کا رُخ نہ کریں۔ اسی جگہ کے متعلق کئی سنسنی خیز روائتیں بھی مشہور تھیں۔ لوگ کہتے تھے کہ ان دوکانوں کے بائیں طرف جو بڑا سا نالہ تھا وہ ایک نکٹے بھوت کا مسکن تھا۔ چاندنی راتوں میں جب نوعمر لڑکے پالے کا میدان جماتے تو یہ مردار بھی نالے سے نکل ان میں شامل ہو جاتا۔ گھنٹوں کھیلتا رہتا تھا پر کیا مجال جو کسی کی گرفت میں آئے۔ اچھے اچھے پہلوان چھو کرے ہانپتے ہانپتے نڈھال ہو جاتے لیکن اسے زیر کرنے کی حسرت ہی رہتی۔ جہاں کسی نے کولی بھری اور وہ یوں نکل

گیا جیسے ہوا کا جھونکا۔ ہاں اگر دو تین مل کر لپٹ گئے تو موری میں گھس غن غنانے لگتا۔ پھر بھلا کون جی دار تھا جو سامنے نکلتا۔ ذرا دیر میں میدان صاف ہو جاتا۔ خدا جانے سچ یا جھوٹ ہم نے تو یہاں تک سنا ہے کہ اس نے کئی راہگیروں کی جانیں بھی لے لیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ وہ کٹا بھتنا آدمی کا بھیجہ کھاتا تھا۔

خیر یہ سب باتیں تو اب پرانی ہوئیں۔ نہ وہ نالہ رہا نہ اندھیریا چھتّہ نہ چھتّہ کے بسنے والے چمار۔ اب تو اس جگہ بڑی بڑی کشادہ گلیاں ہیں دائیں بائیں خوبصورت پختہ اور گنجان آباد مکانات، نیچے گودام۔ دوکانیں غرض سولہ سترہ برس کے لوٹ پھیر میں دنیا ہی بدل گئی البتہ یہاں کے رہنے والے بتاتے ہیں کہ رات گئے ایک سر کٹا بھتنا اب بھی اس علاقہ میں چکر لگاتا ہے۔ سنا ہے کہ آدھی رات سے پچھلے پہر تک اس کا سر سامنے والے چوراہے کے بیچوں بیچ پڑا رہتا ہے۔

انگنا کہار اس چوراہے کے نزدیک کاکن دودھ والے کے سامنے ایک چھوٹی سی دوکان میں رہتا تھا۔ کہار کا پیشہ تو اس نے کافی دنوں پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔ جب ہاتھ کی رکشا چلنے پر ڈولیاں تقریبًا بیکار ہو چلی تھیں البتہ ایک پرانی سی ڈولی دوکان کے باہر ایک بڑی پھولدار کیل میں سدا لٹکی رہتی بالکل اسی طرح جیسے میوزیم میں پرانے زمانے کے آلات حرب لٹکے رہتے ہیں۔ انگنا کی گذر اوقات اب مدت سے ان گھروں کے لین دین پر تھی جن کے دروازوں پر عمر بھر اس نے "ڈولی آگئی ہے" کی صدا لگائی تھی سمٹتا زمانہ دیا لو اور وضعدار لوگ۔ بیچارہ انگنا لشتم پشتم زندگی کی گاڑی گھسیٹ ہی لیتا تھا۔ میرے بچپن میں اس کی عمر کوئی سترّ پچھتّر برس کی ہوگی۔ ہڈیوں کی ساخت جوانی کی توانائی کا پتہ دیتی تھی۔ اور اس بڑھاپے پر بھی محلّے کے اکثر گھرانے اس کی خدمت گذاریوں کے

ممنون احسان تھے کسی کا سودا سلف لادیا۔ کسی کے بچوں کو کھلایا کسی کے گھر کی پوکسی کی اور کسی کا حصہ بجزہ پہنچا دیا۔ بڑھیوں اور بیماروں کے لئے پرانی ڈولی کیل سے اتار اپنے بھائی بند کو ساتھ لے فوراً حاضر ہو جاتا تھا۔ زندگی کا آخری حصہ انگنا نے خدمت خلق اور دین دھرم کے لئے وقف کر دیا تھا۔ جو وقت لوگوں کی ہانک پکار سے بچتا وہ گیتا کے پاٹھ میں لگا دیتا۔ منگل۔ برہسپت اور شنی وار کو جوگیا لباس پہن ایک بڑی سی مالا ہاتھ میں لے نہ جانے کیا کیا جپتا رہتا لیکن اگر اس وقت بھی کوئی بلانے آتا تو مالا زمین پر رکھ آسن توڑ جھٹ اس کے ساتھ ہو لیتا۔ پہلے انسانوں کی خدمت کرتا اور پھر بھگوان کی پوجا۔ مجھے اس وقت تو اتنی تمیز کہاں تھی کہ انگنا کے بارے میں کوئی رائے قائم کرتا البتہ آج جب اس کا خیال آتا ہے تو سوچتا ہوں کہ انگنا ایک عظیم انسان تھا۔ ایک مہان پرش تھا۔ اتنا مہان کہ دیش کے نام نہاد بھگت بھی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

انگنا اِک کہار تھا اور کہاروں میں میں نے آج تک کوئی گورا تو گورا سانولا بھی نہیں دیکھا سب ایسے کالے بھجنگ ہوتے ہیں جیسے کولتار کے مجسمے۔ انگنا بھی اماوس کی رات کی طرح سیاہ تھا۔ خوب تختہ جیسے الٹا توا۔ ہاں چمک دمک بلا کی تھی۔ اس کی جلد پر ہمیشہ ایک تازگی رہتی تھی جیسے گھنٹوں نیل کی مالش کی گئی ہو۔ سیاہ فراخ ماتھے پر جب وہ صندلی تلک لگاتا تو یوں لگتا جیسے مشکی گھوڑا سنہری ساز پہنے کھڑا ہے۔ جوگیا لباس جو وہ اکثر پوجا پاٹ کے سمے پہنتا تھا۔ اس کے جسم پر ایسا کھلتا جیسے چاند کی کرنیں جاڑوں کی رات میں جگمگ جگمگ کرتی ہیں یا پہاڑ کے سیاہ پتھروں کے درمیان زعفران کے خوبصورت کھیت مسکرا اٹھیں۔

چوڑا طباقی چہرہ، کھلی ہوئی چمک دار پیشانی، ابھرا ہوا گول مول سر جس کے

چاروں طرف سفید چھدرے بالوں کی ہلکی ہلکی جھالر، قلمیں گالوں کے وسط تک جن میں ایک مصنوعی اُبھار دیا گیا تھا۔ دہانہ ذرا بڑا۔ مگر اس کا زائد حصّہ گل مچھوں نے ڈھک لیا تھا جن پر سر کے بالوں کی طرح بڑھاپے کی برف گر چکی تھی۔ بڑی بڑی روشن اور چمکدار آنکھیں، ان میں کاجل کے لمبے لمبے ڈورے سُرخ اور ذرا سوجے ہوئے پپوٹے سفید جُھبوال بھنویں جو ناک کے اوپر ایک دوسرے سے مل گئی تھیں۔ آنکھ اور ناک کے درمیان اُبھری ہوئی ہڈی کے پاس ایک بڑا سا مسّہ، کوئی مٹر کے دانے برابر، سیاہ رنگ کا، اس میں دو چھوٹے چھوٹے سفید بال، مسّے کے قریب ہی ناک کی پھننگ پھلکی کی پھلکی، بڑے بڑے کشادہ نتھنے جو ہر سانس کے ساتھ پھیلتے اور سکڑتے تھے۔ ناک کا اوپری حصّہ آنکھوں کے درمیان خم آلودہ ایسا ٹیڑھا میڑھا جیسے املتاس کی پھلی، دانت اگر ہونگے تو زیادہ سے زیادہ چھ سات اور وہ بھی اتنے اندر کہ ان تک نظر کا پہنچنا محال۔ البتہ ہونٹ گھنی مونچھوں سے ہر وقت اپنے وجود کا اعلان کرتے تھے۔ نیلے نیلے، گردے کے گردے، آگے سے یوں مڑے ہوئے جیسے کونڈے کے کنارے اور نچلا ہونٹ عموماً لٹکا رہتا تھا۔

چوڑا چکلا بھرا بھرا سینہ، اس پر اتنے سارے بال جیسے دیسی کمبل پر کھڑا کھڑا روآں بدن پر اکثر گہرے رنگ کی بنڈی دونوں طرف جیبیں لگی ہوئی، ایک جیب میں بڑا سا بٹوہ دوسری میں ایک چھوٹی سی کتاب "بھگوت گیتا"، جسے ہم ان دنوں ہندوؤں کا قرآن شریف کہتے تھے۔ بازو آدھے آدھے کھلے ہوئے جو کبھی سخت صحت مند اور سڈول رہے ہوں گے، کہنی کے جوڑ ذرا نمایاں، چپٹی چپٹی چوڑی چوڑی کلائیاں، انگلیاں اوپر سے کالی، اندر سے سفید کچھ کچھ پیلاہٹ لیئے ہوئے، ہتھیلی کی کھال ایسی جیسے بھینس کی چمڑی، ٹانگوں میں ایک میلی سی دھوتی۔ گھٹنوں سے ذرا اونچی، پیچھے سے اڑسی ہوئی۔ جہاں دھوتی اڑسی

جاتی تھی۔ وہاں کمر میں خاصی گہری نالی، کسی ہوئی پنڈلیاں۔ ان میں ہلکے ہلکے خم جو غالباً
ڈولی اٹھانے کے باعث پڑے ہونگے، کدال جیسے پیر۔ انگلیاں انگوٹھے کی مخالف سمت
میں کافی مڑی ہوئی جس سے بڑی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان ایک خلا پیدا ہوگیا تھا۔
غرض یہ کہ انگنا کہار کسی کونے سے بھلا لگنے کے لائق نہ تھا نرا بھوت ناتھ، کالا بھیلا، بد شکل،
بدوضع، لیکن اگر تاثر کی بات کریں تو اس نے بڑی دلکش اور جاذبِ نظر شخصیت پائی تھی۔
اس کا سراپا مکمل ایثار اور محبت کا سراپا تھا۔ اس کی نرم نرم گفتگو سننے والوں کے کانوں
میں رس گھولتی تھی۔ کہتے ہیں انسان کی شکل پر اس کے اعمال کا عکس پڑتا ہے۔ سو انگنا کی
صورت بھونڈی اور بھدّی ہونے کے باوجود اس کی روحانی پاکیزگی سے جگمگاتی رہتی تھی۔
انگنا سے میرا تعلق محض رسمی نہیں ہے بلکہ مجھے اس کی ذات سے ایک جذباتی لگاؤ
ہے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو انگنا کو اپنی ڈیوڑھی پر کھڑا پایا۔ میں انگنا کی گود میں
کھیلا ہوں۔ میں نے اس کی مونچھ کے بال نوچے ہیں۔ اس کی گنجی چندیا پر سیکڑوں چپت
لگائے ہیں۔ اس کے کاندھے پر چڑھا چڑھا پھرا ہوں اسے گھوڑا بنا کر اس کی سواری
کی ہے اور نہ جانے کتنی بار بیجا ضدیں کر کے اس کے منہ پر تھپّڑ لگائے ہیں۔ میں انگنا کو
بھول ہی نہیں سکتا۔ وہ میرا پہلا دوست، پہلا غمگسار اور پہلا دم ساز تھا۔ اس نے میری اس
درجہ خدمت کی ہے کہ میرا رواں رواں اس کا احسان مند ہے۔ میں روبا تو اس نے مجھے
ہنسانے پر ساری قوت صرف کردی۔ میں ہنسا تو اس نے میرے ساتھ مصنوعی قہقہے لگائے۔
میں کھیلا تو وہ بھی میرے ساتھ بچوں کی طرح کھیلنے لگا۔ میں گرا، پڑا یا میرے چوٹ لگی تو وہ
گھنٹوں تڑپا کیا۔ میری تکلیف کے آثار اس کے چہرے پر نظر آئے۔ بلبلا بلبلا کے
پوچھتا تھا: ''چوٹ تو نا ہی لگی سرکار'' میں نے جو خلوص، جو ہمدردی، جو محبّت اور جو ایثار

انگنا میں پایا۔ وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا ہوگا۔

۱۹۴۷ء میں بٹوارے کے بعد جب فسادات ہوئے تو انگنا بیچارہ قریب المرگ تھا۔ تندرست اور توانا جسم گھل گھل کے نزار ہو گیا تھا۔ اور اعصابی اضمحلال نے اس میں ہلنے جلنے کی سکت کم چھوڑی تھی۔ کوٹھڑی میں پڑے ہوئے اندھے۔ بہرے اور مفلوج انگنا کو باہر کے شور شرابے کا غالباً علم بھی نہ ہوتا لیکن جب سیٹھ سیتا رام اپنی حویلی مقفّل کر کے محلّے کو خیرباد کہہ گئے اور باگڑ دبنیے نے بھی اپنے بال بچّوں اور قیمتی اسباب کے ساتھ کسی ہندو علاقے میں جانے کا فیصلہ کیا تو محلّے کے شرفا نے انگنا کے کان میں بھی ساری بات ڈال دی اور صاف صاف کہہ دیا کہ کل کلاں کو خدانخواستہ اگر کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو ہم ذمہ دار نہیں۔ ہماری مانو تو کسی دوسری جگہ چلے جاؤ۔ انگنا غریب کو اوّل تو حالات کا صحیح اندازہ نہ تھا، دوسرے وہ عمر کی اس منزل سے گذر رہا تھا۔ جہاں پہنچ کر آدمی کے ہر سانس سے یہ صدا آنے لگتی ہے کہ ع

"اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے"

چنانچہ اس نے لوگوں کے اس مشورہ کو کان دھر کے سنا تک نہیں۔ آنکھیں کھول اپنے ججمانوں پر اک نظر ڈالی اور کہنے لگا۔ "یہیاں سے سرکار اب ہمری لہاس ہی اُٹھے گی، سگلی عمر آپ لوگن کی سیوا میں گذار دیئی۔ اب ہم کون جگہ جائی سکت ہیں۔ ہم کا کون مار دیئی گا حجور، آپ سب ہماری گودین کے کھلائے ہیں"۔ لوگوں نے سوچا بات تو ٹھیک ہے۔ انگنا میں اب رکھا ہی کیا ہے جو کوئی اس کا خون اپنے سر لے گا۔ لہٰذا بہت اصرار نہ کیا اور خاموش ہو لوٹ آئے۔

حالات بگڑتے رہے۔ شہر کی فضا دن بدن خراب ہونے لگی۔ نظم و نسق برقرار رکھنے

کے لئے فوج طلب کی گئی۔ دن، رات سڑکوں پر مسلح دستوں کا گشت ہونے لگا۔ گلی کوچوں کے نکڑ پر آہنی دروازے اور پھاٹک چڑھا دیئے گئے۔ ان تمام حفاظتی تدابیر کے باوجود ہر شام آسمان سرخ ہو جاتا۔ چاروں طرف آگ کے شعلے لپکتے۔ سڑکوں پر بے گور و کفن لاشیں ملتیں۔ مذہبی جنون جو ہر دوسرے جنون سے بازی لے جاتا ہے، سارے انسانی معاشرے پر حکمرانی کر رہا تھا۔ اور اس کی حکومت میں دنیا جہنم بن گئی تھی۔

ایک دن دوپہر کے وقت جب رستم خاں چوکیدار مع اپنی ڈاڑھی کے جسے وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، دریا گنج کے ڈپو پر محلّے والوں کے لیے اناج لینے گئے تو انہیں مفسدوں نے گھیر لیا۔ پہلے تو اس آفندی پٹھان نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن جب دیکھا کہ سارا جسم زخموں سے چُور ہو چکا ہے اور سیروں خون بہہ گیا ہے تو لاش کی بے حرمتی کے خوف سے گھر کی طرف بھاگ لیا اور محلے والوں کی گود میں فسانۂ جورِ فلک سُناتے سناتے دم توڑا۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ جب میں نے اسے دیکھا تو جی چاہا کہ ساری دنیا کو آگ لگا دوں۔ کوئی چالیس پچاس زخم کاری اس کے جسم پر لگے تھے جن سے ٹپک ٹپک کر جیتا جیتا خون بہہ رہا تھا۔

رستم خاں چوکیدار کی حسرت ناک موت نے علاقے والوں کے ذہن ماؤف کر دیئے۔ ظلم کا جواب ظلم سے دینے کے منصوبے بننے لگے۔ مجاہدوں کی پُر جوش تقریریں ہوئیں۔ اسلامی غیرت اور حمیّت کو للکارا گیا۔ بہادروں نے بزدلوں کو شرمسار کیا۔ ہتھیار جمع ہوئے اور ان تمام باتوں کے بعد فیصلہ ہوا کہ اجتماعی جتھے بنا کر قریب کی ہندو آبادی پر یورش کی جائے۔ کچھ دیر پہلے جو لوگ رستم خاں چوکیدار کے قاتلوں کی بہیمانہ ذہنیت اور درندگی پر طعنہ زن تھے، اب وہ خود بھی ان حرکتوں پر آمادہ ہو چلے تھے۔ اس

کے علاوہ چارہ بھی کیا تھا ۔ انصاف کی میزان برابر کرنے کا بس یہی ایک طریقہ تھا۔
جب بلّی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کا سوال اٹھا اور پہلے مورچے یعنی باہر ٹہلتی ہوئی فوج کے سامنے ڈٹنے کے لئے غازیوں کی تلاش ہوئی تو سب کی گردنیں ڈھلک گئیں۔ جوش وخروش سرد ہوا ۔ اور ولولوں پر اوس پڑ گئی ۔ آخر ایک گروہ نے دل ہی دل میں کچھ فیصلہ کر کے فضل دین بدمعاش کی قیادت میں کھڑکی کا رُخ کیا لوگ سمجھے کہ غالباً یہ وکٹوریہ ہسپتال کی جانب سے پٹودی ہاؤس پر ہلّہ بولیں گے لیکن کچھ دیر بعد معلوم ہوا کہ انھوں نے جھگڑا گھر کے اندر ہی نمٹا لیا ۔ سنا ہے کہ دو آدمی سہارا دے کر انگنا کہار کو اس کی قبر نما کوٹھری سے باہر لائے ۔ اور فضل دین بدمعاش نے اپنا رامپوری چاقو انگنا کے جھریوں بھرے پیٹ میں گھونپ دیا ۔ انگنا غریب حیرانی کے عالم میں یہ سب کچھ دیکھا کیا اور زبانِ حال سے صرف اتنا کہا ع

قتل کیا آن کر اچّھا کیا!

آج اس واقعہ کو سترہ، اٹھارہ برس گذر گئے لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کل کی بات ہو ۔ انگنا کی زندگی، انسانی عظمت، بھلمانسی اور پُرخلوص خدمت کا جب بھی خیال آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ انگنا کی موت بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی ۔ اس کے انتم بلیدان نے انسانوں کے ایک گروہ کو روحانی آسودگی بخشی۔ ان کے انتقامی جذبہ پر تسکین کے چھینٹے دیئے ۔ اس نے جیتے جی جن کی خدمت کی۔ آخر انھیں ججمانوں کی خاطر ایک دن وہ جان سے گذر گیا ۔ انگنا کی موت بھی فضل دین جیسے ہزاروں، لاکھوں کی زندگی سے بہتر تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ میں انگنا کو مردہ نہیں جانتا ۔ مجھے یقین ہے کہ وہ آج بھی زندہ ہے، اس دنیا میں موجود

ہے اور شاید کھڑکی تفضّل حسین کے چورا ہے پر پچھلی رات کو جو سر پڑا دکھائی دیتا ہے وہ انگنا کہار کا سر ہے۔

انگنا بیچارے کو اپنے ججمانوں کے قدموں سے لگے رہنے کی خواہش پامال تک نہیں ہونے دیتی۔

یارے دُنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

سیّد ضمیر حسن دہلوی

یکے از مطبوعاتِ اِدارۂ ادبیاتِ دِلّی

ارا کین
اِدارۂ ادبیاتِ دِلّی

سیّد ضمیر حسن دہلوی — نگراں
شمیم احمد ایم ۔ اے — سکریٹری
سیّد انتظار عباس رضوی ایم ۔ اے
ذکیہ نگار ایم ۔ اے، بی لِب ۔ ایس سی
ملکہ بیگم قزلباش ایم ۔ اے

مطبُوعاتِ اِدارۂ ادبیاتِ دِلّی

۱ ۔ دِلّی سے دِلّی تک
۲ ۔ مرحوم دِلّی کی ایک جھلک
۳ ۔ خلیل خاں فاختہ
۴ ۔ چند تصویرِ بُتاں
۵ ۔ مومن ایک مطالعہ
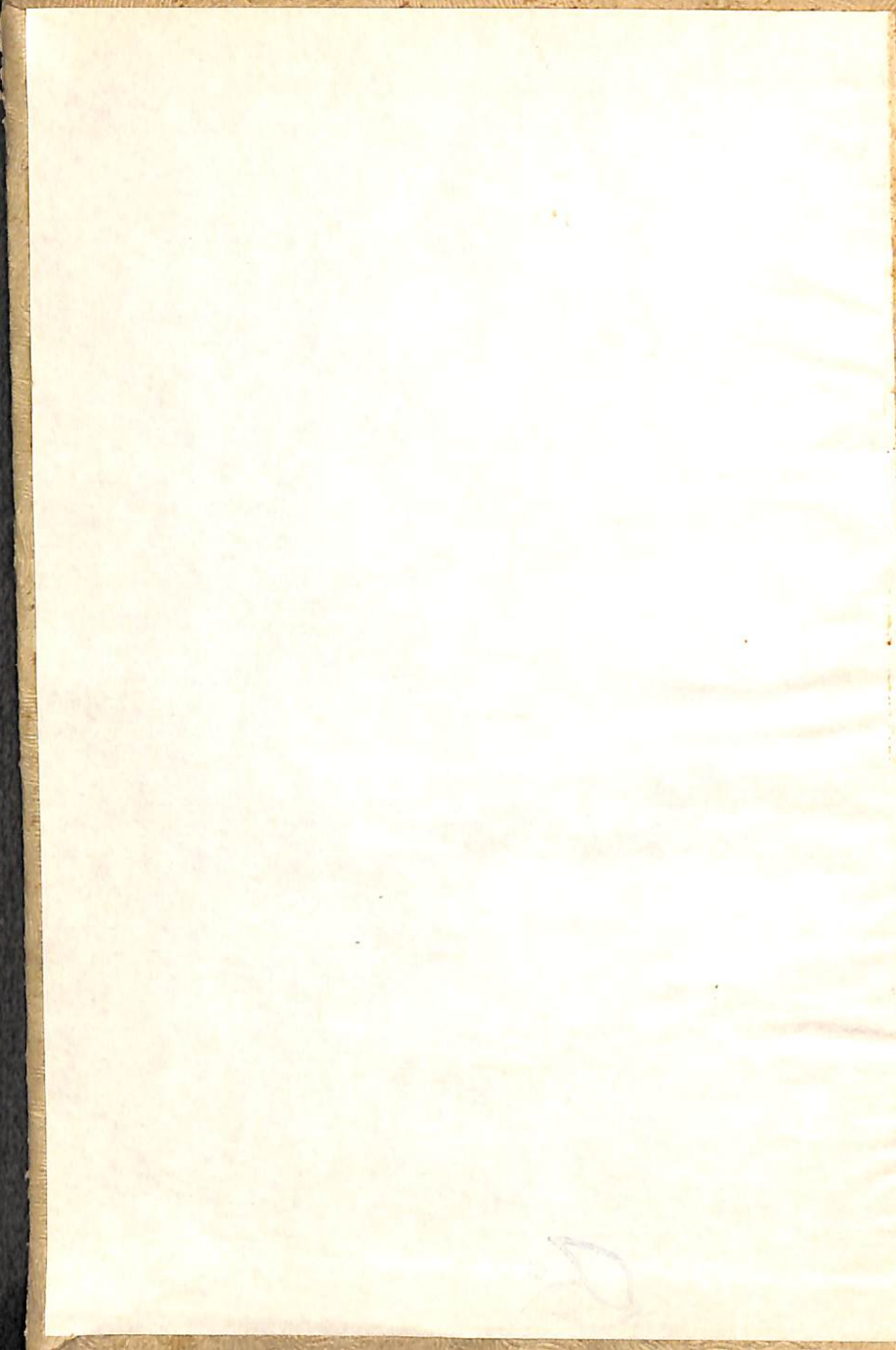
مثنوی گلزارِ نسیم

دیا شنکر نسیم کی مثنوی اُن چند گنی چنی مثنویوں میں شمار کی جاتی ہے جن کو قبول،
اور شہرت دوام حاصل ہے۔ نسیم نے مثنوی سحرالبیان کے دورِ عروج و مقبولیت میں
گلزار نسیم جیسا شاہکار پیش کر کے ایک نئی راہ نکالی ۔ اور اردو زبان کا دامن
محاورات، ضرب الامثال، نادر تشبیہات اور حسین استعارات سے رنگین و دلکش بنا دیا۔
اِس نسخے کی تصحیح قاضی عبدالودود صاحب اور نظر ثانی پروفیسر مسعود حسن رضوی
صاحب نے فرمائی۔ مرتب ہونے کا فخر امیر حسن نورانی صاحب نے حاصل کیا۔ پنڈت
کشن پرشاد کول کا ایک غیر مطبوعہ مضمون نسیم لکھنوی بھی شامل ہے۔ قیمت :- ۲/۵۰

مکتبۂ شاہراہ اُردو بازار دہلی ۶

آزاد پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپا

حرف سروق